سجاد حیدر یلدرم کا فکر و فن

سجاد حیدر یلدرم کا فکروفن

اسود گوہر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

SAJJAD HAIDER YALDERIM KA FIKR-O-FAN

by

Aswad Gowher

Year of Edition 2018
ISBN 978-93-87829-41-1
₹ 250/-

کتاب کا نام	:	سجاد حیدر یلدرم کا فکروفن
مصنف و ناشر	:	اسود گوہر
سال طباعت	:	۲۰۱۸ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
تعداد	:	۳۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

تقسیم کار

کتاب دار، 108/110، جلال منزل،
گراؤنڈ فلور، ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی 400008

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

SAJJAD HAIDER YALDERIM KA FIKR-O-FAN

by

Aswad Gowher

Year of Edition 2018
ISBN 978-93-87829-41-1
₹ 250/-

کتاب کا نام	:	سجاد حیدر یلدرم کا فکر و فن
مصنف و ناشر	:	اسود گوہر
سال طباعت	:	۲۰۱۸ء
قیمت	:	۲۵۰ روپے
تعداد	:	۳۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

تقسیم کار

کتاب دار، 108/110، جلال منزل،
گراؤنڈ فلور، ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی 400008

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

انتساب

اپنی دادی

عزیزہ خاتون (مرحومہ) کے نام

دعائیں باقی رہ گئیں
ہاتھ رخصت ہوئے

اسود گوہر

فہرست

ایک ضروری کتاب

شعر و ادب کے معاملات و تصورات عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ اکثر کسی بھی شاعر و ادیب کے بارے میں کسی وجہ سے ایک رائے بن گئی تو تا دیر آنے والے لوگ اسی رائے کو دُہراتے نظر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غریب ایک دائرہ میں محدود ہو کر اپنی بس ایک مختصر سی پہچان بنا کر رہ جاتا ہے جو وقت کی دھول میں اکثر دھندلا جاتی ہے اور اس کے اردگرد جھانکنے چھاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ممتاز ادیب و فنکار، مترجم سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اُنھیں ایک سُبک رومان پرور ادیب اور معمولی مترجم کے طور پر لیا گیا اور زیادہ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر وہ تاریخ ساز فنکار اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کے والد نہ ہوتے تو شاید وقت سے پہلے ہی بُھلا دیے جاتے۔ شکر ہے کہ کسی بھی حوالے سے بہر حال اردو دنیا میں یلدرم کا ذکر آج بھی ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب میرے عزیز دوست اور ممتاز ناول نگار نورالحسنین کا خط ملا کہ اسود گوہر ان کی بھانجی ہیں اور انھوں نے سجاد حیدر

جب صنفِ ناول کے تصورات واضح نہ تھے۔ ہیرو، پلاٹ وغیرہ کا کوئی جدید تصور نہ تھا۔ یلدرم اس مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ایک بات اور جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے ابھی تک توجہ نہیں کی۔۔۔۔یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ امیر ہونا کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔غریب اور غیر تعیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے جتنا کہ تعیم یافتہ امیر۔۔۔ابھی تک اردو میں غریب کی زندگی کا نقشہ کھینچا جانا باقی ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی کے متعلق ناول لکھے جائیں۔"

اب ذرا اسود گوہر کے یہ جملے ملاحظہ کیجیے۔

"قابل ذکر بات ہے کہ جس شخص کو صرف رومان پرست اور ادب برائے لطیف کا حامی کہا جاتا ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑنے سے بھی کئی سال قبل اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ غریب اور غیر اہم تصور کیے جانے والے اشخاص کی زندگی پر ناول لکھے جا سکتے ہیں اور انھیں بطور ہیرو پیش کیا جا سکتا ہے۔"

یہ باتیں غور طلب ہیں اور یلدرم سے متعلق نئے تصورات پیش کرتی ہیں۔ملاحظہ کیجیے

بھی یکجا کر کے اسے کتابی شکل میں ضرور شائع کریں۔ یہ ایک بڑا کام ہوگا۔ فی الحال اس کتاب کی اشاعت پر میں ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس مختصر سی کتاب میں بہرحال تنقید و تحقیق دونوں ابواب روشن ہوئے ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

الہ آباد۔ یوپی

ایک بار سمٹ کر اس مقالے میں قید رہ جائیں گی ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خود اس مقالے کا مطالعہ کریں اور اُن کے فن اور اُن کی اہمیت کو سمجھیں۔

عزیزی اسود گوہر ایک محنتی ریسرچ اسکالر ہیں ۔ اور اس وقت پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہی ہیں ۔ اپنے ریسرچ کے موضوعات سے ہٹ کر بھی مطالعہ کرتی ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تک اُن کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے' جسارت' اور' تنقیدی محاکات' کے عنوان شائع ہو چکے ہیں ۔ ان کتابوں کی نہ صرف ادبی حلقے میں پذیرائی ہوئی بلکہ مہاراشٹر ساہتیہ اُردو اکادمی نے اُنھیں نیو ٹیلنٹ(New talent) کے تحت ریاستی سطح کا ایوارڈ ، ساحر لدھیانوی ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

اسود گوہر کا تعلق تنقیدی ادب کے ساتھ ہی ساتھ تخلیقی ادب سے بھی ہے۔ وہ ایک عمدہ انشائیہ نگار بھی ہیں جن کے انشائیے ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ مجھے اُن سے قوی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

نورالحسنین

اورنگ آباد (دکن)

پیش لفظ

اردو زبان کس طرح وجود میں آئی؟ کس طرح ادب کا حصہ بنی؟ کس طرح نظم کے بعد دیگر اصناف نے ادب میں اپنی جڑیں مضبوط کیں؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر تحقیق کا کام ہمیشہ جاری رہے گا۔ بقول پیغام آفاقی "تجربے چاہے ادب میں ہوں یا کہیں اور ـــــ یہ عموماً ارتقائی عمل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس میں چند تجربے ارتقا کے تخریبی مرحلوں سے وابستہ ہوتے ہیں جو انہدام کے عمل میں معاون ہوتے ہیں اور چند تعمیری مرحلوں سے وابستہ ہوتے ہیں جو نئی ابھرتی ہوئی ساخت کو شکل عطا کرتے ہیں۔ تعمیری تجربوں میں بھی کچھ دیرپا ہوتے ہیں جو نئی ساخت کی ہڈی کی طرح دائمی مقام حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ پتوں کی طرح اپنے موسم کے ساتھ جھڑ جاتے ہیں۔" ٹھیک اسی طرح صنف افسانہ کے ارتقائی عمل کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو سجاد حیدر یلدرم کا فن ہمارے افسانوی ادب کا وہ حصہ ہے جس نے ابھرتی ہوئی ساخت کو شکل عطا کی۔

یلدرم کا فن بھی خزانوں میں دبا پڑا رہنے کے باوجود آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں کہانی کے موضوع کے ساتھ زبان کا خاص خیال رکھا اور روایت سے انحراف کرتے ہوئے بے باکی کے ساتھ ایک نئی صنف میں ان تمام موضوعات کو اتارنے کی کوشش کی جو سماج کی اصلاح کے لیے ضروری خیال کیے جاتے تھے۔ یلدرم کا دور سماجی و سیاسی کشاکش کا دور تھا اور وہ اپنے قارئین کو ایک

صحت مند معاشرے سے متعارف کرانا چاہتے تھے تاکہ قوم کا شعور نئی تبدیلیوں کو قبول کر سکے۔لہذا ان کی تخلیقات چاہے افسانے ہو یا ناول ان میں جدت نظر آتی ہے۔ یلدرم کی کاوشیں جو ہمارا کلاسیکی سرمایہ ہے کا مطالعہ قاری کو ہر دور میں ایک نیا لطف دیتا ہے۔اس میں انھوں نے جن مسائل کو اٹھایا ہے ان میں آج بھی چند ایسے ناسور ہیں جن سے ہمارا معاشرہ کہیں نہ کہیں جوجھ رہا ہے۔

جس طرح سجاد حیدر کی تخیقات دلچسپ ہیں اسے طرح ان کا قلمی نام بھی کافی دلچسپ ہے۔ درسی کتابوں سے ہٹ کر جب میں نے اردو ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا تب مجھے جس نام نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ تھا ''یلدرم''۔ یلدرم کو جاننے کے لیے میں نے ان کی تخیقات کی تلاش شروع کی۔اس وقت مجھے بہت مایوسی ہوئی جب ہر جگہ سے مجھے منفی جواب ملا کہ ان کی تخیقات اب آوٹ آف پرنٹ ہیں۔حیرت کی انتہا تو اس وقت ہوئی جب درجن بھر سے زائد تنقیدی کتابوں میں مجھے ان کا ذکر صرف ایک جملے میں ملا کہ'' سجاد حیدر یلدرم ادب لطیف کے بانی تھے۔''اسی تلاش اور جستجو نے مجھ سے کئی کتابیں پڑھوائیں۔آخر کار میں اپنی تلاش میں کامیاب ہوئی۔انٹرنیٹ پر لگاتار Search کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سنگ میل (لاہور) نے خیالستان کا ایک ایڈیشن 2006 میں شائع کیا۔لہذا گلف میں رہائش پذیر اپنے رشتہ دار کے ذریعے میں نے یہ مجموعہ حاصل کیا۔

مجموعہ ''خیالستان'' اور سجاد حیدر کے عہد کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس میں کہیں نہ کہیں حقیقت نگاری اور مقصدیت شامل ہے اور اس پہلو کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا

باب اوّل

اردو نثر کی روایت میں یلدرم کی انفرادیت

[illegible]

شمار اردو کے اولین نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔

اردو نثر کی اصناف میں داستان وہ اہم صنف ہے جس کی ابتداء چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے ہوئی۔ یہ داستانیں بیسویں صدی کے اوائل تک عوام و خواص میں بے حد مقبول رہی جس کی تاریخ بہت طویل ہے۔ ولی کے بعد جس طرح شمال میں اردو شاعری شروع ہوئی اسی طرح داستان گوئی کا آغاز بھی دکن ہی سے ہوا ہے۔ اردو نثر کے پہلے داستان گو کی حیثیت سے ملا وجہی کا نام سامنے آتا ہے۔ جنھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر اردو ادب کی پہلی تمثیلی داستان "سب رس" لکھی۔ وجہی سے قبل ممکن ہے جنوبی ہند میں اردو نثری قصے لکھے گئے ہوں گے جو اب نایاب ہے۔ وجہی کی ایک اور نثری تصنیف "تاج الحقائق" ہے جس کے بارے میں محققین کی رائے میں اتفاق نہیں۔ بعض محققین اسے "وجیہہ الدین محمد" کی تصنیف بتاتے ہیں جبکہ مولوی عبدالحق اسے وجہی کی تصنیف بتاتے ہیں۔

شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتداء فضلی کی "دہ مجلس" ۱۷۳۲ء کے ذریعے ہوئی۔ اسی عہد کی دوسری نثری داستان میر محمد حسین عطا خان تحسین کی "نو طرز مرصع" ہے جو مشہور قصہ "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ یہ داستان ۱۷۹۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اسے تحسین نے عوام کے لئے نہیں بلکہ خواص کے لئے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے دقیق الفاظ، فارسی تراکیب، استعارات و تشبیہات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ اس کا اسلوب مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے اسلوب میں یکسانیت کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ داستان نے اس وقت جنم لیا جب انسان کے

تخیل نے عقل سے ماورا دنیا میں جھانکنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے داستان کو بے معنی چیز سمجھا جانے لگا جبکہ ان داستانوں کا ماحول اس کے کردار ان کی محرومیاں، خواہشات اور خوابوں کے حصول کا مرحلہ اور اس جدوجہد میں طرح طرح کے مصائب کا سامنا درحقیقت حقائق سے نبرد آزما ہونے کی خواہش کا ہی اظہار ہے۔ صنف داستان پوری کائنات کو اپنے اندر سمونے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ جس میں معاشرے کی زیادہ واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اردو داستانوں سے لکھنؤ اور دلی کی شاہی تہذیب کی پوری تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ہر جنس کی تفصیلات اکٹھا کی جائیں تو ایک اپنے رنگ کی انسائکلو پیڈیا تیار ہو سکتی ہے۔ مختلف قسم کے کھانے، طرح طرح کے ملبوسات، سواری کے جانوروں کی آرائش، باجوں کے نام، راگوں کے اقسام، مطربوں کے فرقے، آتش بازی کی قسمیں ظروف کی تفصیلات، شکاری جانوروں کے نام، ملازموں کے درجات، چوروں کے فرقے، آبی سواریاں غرضے کتنی اصطلاحیں ہیں جو ان میں بھری پڑی ہیں۔ داستانیں کیا ہیں ایک بے پایاں دنیا ہے۔''(۱)

۱۸۰۰ء اردو نثر کی مقبولیت اور ترقی کے لئے ایک اہم سال مانا جاتا ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سن میں ہندوستان کے سیاسی حالات بدلنے

گئے تھے اور مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فارسی زبان کو دیمک لگ چکی تھی اور اردو زبان عوامی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں نے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے۔ اس وقت ہندوستان میں جتنے ادبی مراکز تھے سب بدامنی اور انتشار کا شکار تھے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے بہترین ادیبوں کو فورٹ ولیم کالج میں جمع کیا جن میں میر امنؔ، شیر علی افسوسؔ، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطفؔ، حیدر بخش حیدری، میر کاظم علی جوانؔ اور للو لال جی کا شمار ہوتا ہے۔

دراصل اس کالج کے قیام کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو تعلیم دینا تھا۔ جس میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ تدریسی مقصد کے لئے اردو میں کتابیں ہی نہیں تھیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کا کام ان ادیبوں نے کیا اور اردو کی پہلی قواعد بھی پر لکھی گئی۔ فارسی اور عربی داستانوں کے ترجمے سلیس اور آسان زبان میں لئے گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت ترجمہ کی گئی داستانوں میں میر امنؔ کی ''باغ و بہار'' نے خصوصی شہرت پائی۔ اس داستان کے پرتکلف اسلوب نے اردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ کیونکہ اس وقت تک لکھی گئی داستانوں کا اسلوب بہت رنگین اور دلکش ہوا کرتا تھا لیکن تکنیک سادہ ہی ہوا کرتی تھی۔ میر امنؔ نے روایت سے بغاوت کی اور ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو بعد کے آنے والی نسلوں کے لیے ادبی اسالیب کا پیش رو ثابت ہوا۔

'باغ و بہار' میر امن کا ایسا شاہکار ہے جس کا براہ راست تعلق اس عہد کے معاشرتی ماحول سے تھا۔ اس داستان کے سبھی کردار اپنے گرد و پیش کی نمائندگی کرتے

ہیں۔ جن میں ان کا ظاہری حلیہ ہی نہیں بلکہ ان کی زبان بھی اپنے ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

"میر امن نے ہر کردار کی حیثیت اور جنس کی مناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔ پہلے درویش کی بہن اس سے جس طرح بات چیت کرتی ہے اس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ بہن بول رہی ہے۔ نازنین پہلے درویش سے اس طرح گفتگو کرتی ہے کہ وہ بھی اس کی حیثیت کو سمجھ جاتا ہے۔" (۲)

مختصر سے عرصے میں ہی اُردو نثر پر فورٹ ولیم کالج کے باہر بھی کام شروع ہو چکا تھا۔ جو ادیب اُردو نثر کی خدمت کر رہے تھے ان میں فقیر محمد گویا اور رجب علی بیگ سرور کے نام سرفہرست ہیں۔ ان میں سرور آگے نظر آتے ہیں اور ان کی "فسانہ عجائب" نے سلاست کی جگہ مروجہ پر تصنع اسلوب اختیار کیا۔ اس داستان میں سرور نے لکھنؤ کے طرز معاشرت کو شامل کیا۔ مگر اسلوب کے اعتبار سے اس داستان کی زبان پر قدیم رنگ کا غلبہ تھا۔ لہٰذا "فسانہ عجائب" جدید نثر کے لئے کوئی روایت قائم نہ کر سکی۔ اسی دور میں مذہبی ادبیات نے بھی تاریخ رقم کی۔ دلی کے بزرگان دین نے قرآن شریف کے اُردو تراجم کئے تو وہیں دوسری طرف سید انشاء اللہ خان انشاء اور قتیل شفائی نے لسانیات کے موضوع پر پہلی کتاب "دریائے لطافت" 1848ء میں لکھی۔ دریائے لطافت میں انھوں نے اُردو زبان کی ساخت پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی اہمیت آج بھی قابل قبول ہے۔

میر امّن کے بعد اُردو نثر کے ارتقاء میں غالبؔ ایک ایسا نام ہے جس نے سادگی کو پرکاری میں تبدیل کر دیا۔ غالبؔ کے خطوط نے اپنے سادہ اسلوب کے ذریعے اُردو نثر کی دنیا ہی بدل دی۔ خاص طور سے ان کے خطوط نے ادب کے مزاج اور اسالیب کو بہت تنوع دیا۔ غالب کے خطوط مکمل ظرافت کا ایک نمونہ ہے۔ جو تاریخی اہمیت کے ساتھ دستاویزی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں غالب کی زندگی، ان کے شب و روز، دہلی کے تمدن حالات کی سچی اور واضح تصویریں دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالب نے ان میں کہیں ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے تو مزاج کے کئی پہلوؤں سے بھی روشناس کرایا ہے۔ کہیں زندگی کے تلخ و شیریں تجربے مشاہدے پیش کئے ہیں تو کہیں اپنے حالات زندگی پر ماتم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب بہت جلد اہمیت اختیار کر گیا لیکن کسی اور سے اس کی نقل نہ ہو سکی۔

اس عہد کے دوسرے ممتاز نثر نگاروں میں ماسٹر رام چند اور غلام غوث بے خبر ہیں۔ جن کے خطوط بھی ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں پریس کے قائم ہو جانے سے بھی اُردو نثر کے ارتقاء میں مزید تیزی آگئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے ٹائپ کو فورٹ ولیم کالج کے لئے ترجمہ کی جانے والی کتابوں کے لئے پسند کیا۔ یہاں کی کتابیں کانپور، دہلی اور لکھنؤ میں قائم ہوئے لیتھو پریس میں چھپنے لگیں جن کی تعداد بھی زیادہ ہوتی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے تقریباً ساٹھ تا ستر سال تک اُردو نثر محض سادگی و سلاست داستان اور خطوط نویسی تک ہی محدود تھی۔ لیکن 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اس ناکامی نے مسلمانوں کو ذہنی،

علمی، سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی غرض کہ ہر سطح پر اذیت پہنچائی۔ ان حالات سے مسلمانوں کو ابھارنے کے لیے سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے قوم کو ایک افادی اور مقصدی تحریک دی۔ جو آگے چل کر علی گڑھ تحریک کہلائی۔ دراصل علی گڑھ تحریک اردو نثر کے ارتقاء کی ایک ایسی کڑی ہے جس نے اردو ادب کو علمی و ادبی درجہ دلایا۔

جاگیردارانہ نظام کے اختتام نے مسلمانوں کو ذہنی، اقتصادی اور معاشی پستی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ جس کی اصلاح کے لیے ضروری تھا کہ وہ نئی باتوں کو اپنائیں لیکن انگریزوں کی لائی ہوئی نئی باتیں ان کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب اور عقائد کے لیے خطرہ ثابت ہوگی۔ اس وقت تک اردو ادب میں علمی اور فلسفیانہ مسائل کو پیش کرنے کا رواج عام نہیں تھا۔ لیکن قومی اصلاح اور مسلمانوں کو ذہنی پستی سے نکالنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہو گیا تھا کہ اردو میں اچھا ادب جنم پائے۔ شاعری اور تنقید کے اصول مرتب ہوں اور ایک زندہ قوم کے مسائل، حالات اور خیالات کی ترجمانی ہو سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں علی گڑھ تحریک آگے آئی۔ مولانا محمد حسین آزاد، سرسید اور ان کے رفقاء میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ نے نہ صرف مسلمانوں کی ذہنی و تعلیمی اصلاح کی بلکہ اردو ادب کو بھی نئی بلندی عطا کی۔

علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خان (17 اکتوبر 1817ء _ 27 مارچ 1898ء) شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز سے بہت متاثر تھے جو مذہبی تحریکوں کے رہنما تھے۔ سرسید نے اپنی ملازمت کے 35 سال مختلف اضلاع میں گزارے اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ اس زمانے کی تصانیف میں رسالہ

''اسباب بغاوتِ ہند'' بہت اہم ہے۔ جو ان کی صاف گوئی اور بے خوفی کا شاہد ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اشاعت تعلیم کے لیے بھی بہت کوششیں کی۔ سب سے پہلا مدرسہ انھوں نے مراد آباد میں قائم کیا۔ جس میں فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ 1864ء میں انھوں نے دوسرا اسکول غازی پور میں قائم کیا جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن سرسید کا اہم کام سائنٹفک سوسائٹی کی غازی پور میں بنیاد ڈالنا تھا۔ جس کا اہم مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رواج دینا تھا۔ یہاں پر سائنس پر لیکچر دیئے جانے لگے۔ بعد میں یہ دفتر علی گڑھ منتقل کر دیا گیا اور اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اخبار سائنٹفک گزٹ جاری کیا گیا۔ جو بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کہلایا۔

سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تاکہ وہاں کے تعلیمی اداروں کا معائنہ کر کے ہندوستان میں بھی اسی طرز کا ایک کالج قائم کر سکے۔ وہاں جا کر انھوں نے اپنے گھر کے اثاثے کو فروخت کر کے ایک انگریز ''ولیم میور'' کی کتاب ''لائف آف محمد'' جو کہ چار جلدوں پر مشتمل تھی۔ جس میں سیرت پاکؐ کے خلاف زہر افشانی تھی اس کا جواب ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر دیا۔ انگلستان سے واپس آ کر انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کا اجراء کیا۔ اور ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کی بنیاد اس وقت ڈالی جب وہ بنارس میں تعینات تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا جس میں ان کے مخلص دوستوں کا بھی تعاون رہا۔ پروفیسر آلِ احمد سرور اس تحریک کے متعلق رقمطراز ہیں:

''سرسید کی تحریک ایک محدود سیاسی یا تعلیمی تحریک
نہیں تھی۔ یہ ایک جامع ذہنی تحریک تھی جس کا مقصد

> تہذیب کو ایک نیا تصور دینا تھا۔ اور سماج میں ایک
> بڑا انقلاب لانا تھا۔ اس انقلابی تصور کے لئے
> انہوں نے مغربی فکر وتحریر سے پورا فائدہ اٹھایا اور
> اس سے بہت کچھ اخذ کیا۔ سرسید کی تحریک کو سرتاسر
> وقتی مصلحت یا ضرورت کی آواز سمجھنا حق تلفی
> ہوگی۔"(۳)

ادبی نقطہ نظر سے علی گڑھ تحریک سے جدید اُردو ادب کا آغاز ہوا۔ سرسید اور ان کے دیگر رفقا، محسن الملک، چراغ علی، نواب وقار الملک، مولوی ذکا اللہ وغیرہ نے مقفی ومسجع نثر کو ختم کر کے سلیس وسادہ نثر کو رواج دیا۔

محمد حسین آزاد (1830_1910) اردو ادب کے اہم اور نہایت عظیم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ بہترین انشا پرداز، اعلیٰ پایہ کے ادیب اور عمدہ مصنف تھے۔ انھوں نے انشا پردازی اور نثر نگاری کا اچھوتا طرز اختیار کیا چاہے وہ نظم ہو یا نثر ان کی تخلیق بامقصد اور افادیت سے بھری ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خالص اردو زبان کو فروغ دیا۔ عربی اور فارسی کے الفاظ سے اجتناب کر کے سادہ عبارت کی بنیاد ڈالی۔ محمد حسین آزاد کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ انھوں نے متعدد معرکتہ الآرا تصانیف تحریر کیں ہیں جن میں سب سے اہم "آب حیات" ہے۔ جس نے اردو ادب میں تنقید نگاری کے نقوش ابھارے۔

اس طرح تنقید نگاری کی ابتداء میں مولانا محمد حسین آزاد کے بعد الطاف حسین حالی کے علاوہ سرسید اور ان کے دیگر رفقاء نے بھی تنقید نگاری کی طرف قدم

بڑھ جائے۔ لیکن حالی سے نئی تنقید اور سوانح نگاری کی ابتداء ہوتی ہے۔ سوانح نگاری میں حالی کے یہاں نفسیاتی غیر جانبداری ملتی ہے جو سوانح عمری کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کی تصنیف حیات جاوید صرف سوانح عمری نہیں بلکہ اس میں انھوں نے ملک کی اس وقت تک کی تعلیمی، ادبی، سماجی اور ذہنی تاریخ کے ہر نقش کو ابھارا ہے اور ہمارے تنقیدی ادب کی ماہیت، نوعیت، زندگی اور ادب کے متعلق اور سماجی ادب کے متعلق جو بحثیں کیں ہے وہ سب "مقدمہ شعر و شاعری" میں موجود ہیں۔ انھوں نے مقدمہ میں ادب سے متعلق تنقید کے اصول مرتب کئے اور اس نظریے کو اہمیت دی کہ اب ہمارا ادب قومی، ذہنی اور تہذیبی زندگی کے اظہار کا بہترین وسیلہ ہے۔

حالی کی طرح شبلی بھی بیک وقت شاعر، ادیب، عالم، مفکر اور سوانح نگار تھے انھوں نے علی گڑھ تحریک اور سرسید سے روشنی حاصل کی لیکن بعد میں چند اختلافات کی وجہ سے اپنا راستہ الگ کر لیا اور ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔ شبلی اس طور پر بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے ذریعے اُردو ادب میں تاریخ نویسی کی ابتداء ہوئی۔ ان کے نزدیک تاریخ محض واقعات کا بے ترتیب انبار نہیں بلکہ علت و معلول کا وسیع سلسلہ ہے۔ شبلی نے عملی و نظری تنقید کے بلند نمونے بھی پیش کیے۔ "سیرت النبی"، "الفاروق"، "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" ان کے وہ نقوش ہیں جس نے اُردو ادب میں وقیع اضافے کیے۔

سرسید کے رفقاء میں شامل ڈپٹی نذیر احمد وہ نام ہے جن کے ذریعے اُردو نثر میں ناول نگاری کی ابتداء ہوئی۔ وہ مترجم قرآن بھی ہیں لیکن ادب میں اُردو کے ایک باکمال ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں

تہذیبی کشاکش کو موضوع بنایا ہے ان کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر نے اُردو ناول نگاری کو نئے منزلوں کا پتہ بتایا۔ سرشار کے انداز نگارش اور فسانہ کے تہذیبی پس منظر سے ان کی ابدیت وابستہ ہے۔ شرر نے تاریخی ناول نگاری کے ذریعے اردو ادب میں اضافہ کیا تو وہیں مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر سوانحی ناول نگاری کا آغاز کیا۔

اُردو نثر کی ایک اور اہم صنف ڈرامہ ہے جس کی ابتداء 1853ء میں امانت کی اندر سبھا سے ہوتی ہے۔ بہت دنوں تک نظم اُردو ڈراموں پر حاوی رہی لیکن آہستہ آہستہ نثر نے اپنا قبضہ جمالیا۔ اُردو ڈرامہ کے ارتقاء میں پارسی کمپنیوں کا اہم حصہ ہے۔ طالب بنارسی، احسن لکھنوی اور بیتاب دہلوی ان کمپنیوں کے اولین ڈرامہ نگار ہیں۔ لیکن آغا حشر کاشمیری وہ نام ہے جس نے اُردو ڈرامہ کو بام عروج عطا کیا۔ ان کے بعد امتیاز علی تاج نے ڈرامہ ''انارکلی'' لکھ کر جدید اُردو ڈرامہ کا آغاز کیا۔

طنز و مزاح بھی اردو ادب کی ایک اہم صنف کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ جس کی شروعات ''اودھ پنچ'' کے ذریعے ہوئی۔ ''اودھ پنچ'' ادبی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ اس میں اچھے مزاح نگاروں کا ایک حلقہ تھا۔ 1877ء میں جاری ہوئے اس ہفتہ وار کے پہلے مدیر سجاد حسین تھے۔ سیاسی اعتبار سے اودھ پنچ بڑا ترقی پسند تھا اور طنز و مزاح سے لپٹی تحریر میں برٹش راج کے تشدد اور اقتصادی لوٹ مار پر چوٹیں کرتا تھا۔ اس کی بدولت اُردو نثر میں ظریفانہ ادب کا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ اودھ پنچ کے مضمون نگاروں میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرشاد، برق، اکبر الہ آبادی، وغیرہ اہم ہیں۔ ''اودھ پنچ'' اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس

نئے ''ایسے'' (انشائیے) اور ''خاکے'' کے ابتدائی نقوش بھی واضح ہوئے۔

اس عہد میں رسائل و جرائد بھی کافی تعداد میں شائع ہونے لگے تھے۔ جن کا معیار دن بدن بلند ہو رہا تھا۔ ان میں سیاسی مباحث، ادبی، مذہبی، تاریخی، سائنسی اور معاشی مسائل پر مضامین اس عہد کی ضروریات کے مطابق ہوتے تھے۔ سرسید وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے اردو صحافت کو ایک قوت اور اصلاح معاشرت کا ذریعہ بنایا۔ سرسید کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد، حسن نظامی، مولانا محمد علی اور ظفر علی خان کا شمار ان صحافیوں میں ہوتا ہے جن کا اپنا ایک نام ہے۔ مولانا محمد علی کے ''ہمدرد''، سید جالب کے ''ہمدم'' اور مولانا ابوالکلام کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کوہ آتش فشاں سے کم نہیں تھے۔ جس میں ہمیشہ برٹش سرکار کو نشانہ بنایا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' نے جنگ آزادی کی رفتار کو بڑھایا۔ تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''لسان الصدق'' میں ''سچی باتیں'' لکھ کر ایک مخصوص انداز قائم کیا۔

خاص طور سے مولانا آزاد (1889ء_1958ء) نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے ایک نئے طرز کی اخبار نویسی کو جنم دیا۔ ان کے نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عربی و فارسی الفاظ کا حسین سنگم نظر آتا ہے۔ اس میں جہاں شاعرانہ رنگ پایا جاتا ہے وہیں زبان کی رنگینی اور زور و قوت کا ظہور ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس میں ڈوب جاتا ہے۔ مولانا آزاد جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی اچھے خطیب بھی تھے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کثیر الجہات تھی وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد، تکلیف اور پریشانیوں سے گھری رہی۔ لیکن انھوں نے اسے ناکامی اور مایوسی

سے تعبیر کرنے کے بجائے اپنے مقصد حیات کے حصول کے لیے جذب اثار سے منسوب کیا۔انھوں نے ''الہلال'' اور ''ابلاغ'' میں اپنے مخصوص مبلغانہ انداز میں اصلاحی مضامین اور خوبصورت اداریے لکھے جوایک ضرب المثل بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ان کی نثر شاعری سے قریب ترین تھی۔جو خطابت اور حسن کاری سے آراستہ تھی۔مولانا آزاد کی طبیعت میں چونکہ تغیر پسندی کا عنصر زیادہ ہی تھا اس لیے ہر طرح کی تبدیلی ان کے مزاج میں در آئی ہے۔پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد اُردو نثر کے اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس پر سرسید کے عقلیت پسندی سے جڑے ہونے کے باوجود رومان اور جذباتی اظہار غالب ہے لیکن اُردو نثر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ رومانیت اور جذبات پرستی کے دھارے کو علمیت اور دانشوری کی روایت سے جوڑنا اور نثری اظہار میں اس طرح ادبی حسن پیدا کرنا ہے کہ ان کی نثر کا تجزیہ کیا جائے تو بڑی آسانی سے انہیں ایک رومانی نثر نگار ثابت کیا جاسکتا ہے۔'' (۴)

انیسویں صدی کا آخر چوتھائی اور بیسویں صدی کی ابتداء وہ زمانہ ہے۔ جب اُردو نثر نے بہت تیزی سے اپنے ارتقاء کے طرف قدم بڑھائے۔اس وقت تک اُردو نثر میں تقریباً ہر صنف کے نقوش واضح ہوگئے تھے۔وہیں اس دور میں اقبال نے بھی اپنے لیے ایک الگ رنگ کا انتخاب کیا اور برصغیر ہندو پاک کے نئی تعلیم یافتہ نسل

پر بہت گہرا اور دیرپا اثر قائم کیا۔ اقبال نے الفاظ، اسالیب، تعبیرات وتراکیب اور خیالات واستعارات کا ایک تنوع اُردو ادب کو دیا۔ اقبال کے علاوہ ٹیگور اور سروجنی نائیڈو کی رومانیت بھی ادب میں جگہ لے رہی تھی۔ جو بنگال اسکول کے مصوری کی غنائی رومانیت اور چغتائی آرٹ کے ادبی اطافت ونزاکت کی مصوری کا ترجمہ تھے۔

ٹیگور کی شاعری بنگال کے قدیم ویشنوی شعراء کے اثرات سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں چنڈی داس اور ودیاپتی جیسے شعراء کی زندگی اور فن، رومانوی ماورائیت اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں اپنے دور کے سماجی جمود اور شاعرانہ اقدار کی پامالی کے بے شمار نمونے ملتے ہیں۔ جن سے ٹیگور نے اپنی بغاوت کا اظہار بڑے شدید طریقے سے کیا ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن

> ''فطرت کی طرف واپسی کی وہ معصوم اور حسن کارانہ امنگ، کائنات کو محض ایک جذبے یعنی ابدی مسرت کا محیط projection سمجھنا یہاں بھی ملتا ہے۔ نئے اسالیب نظم کے تجربے شوکت پاستن کا عشق، سنگیت اور سادگی ادا، فطری حسن سے لگاؤ ٹیگور کی شاعری کے رومانوی رجحان کو نمایاں کرتا ہے۔ بائرن کی طرح ٹیگور نے بھی قومی تحریک اور آزادی کی لگن کا واضح طور پر اعلان کیا ہے۔ جاپان کے جارحانہ اقدام کے مخالفت اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی حمایت بار بار کی ہے۔'' (۵)

انھوں نے مادی زندگی اور کاروباری انداز فکری مخالفت کی ہے۔ اور انسانی ذہن کی آزادی کے نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ ساری بغاوتیں رومانیت ہیں اور ٹیگور اس کے علم برداروں میں سے تھے۔

ایسے عالم میں جب کہ چاروں طرف سیاسی کشاکش جاری تھی اور جس کا براہ راست اثر اردو ادب پر بھی پڑ رہا تھا سجاد حیدر یلدرم نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مضامین کے ذریعے کیا۔ ان کا پہلا مضمون ناول نویسی سے متعلق تھا جو رسالہ "معارف" میں اکتوبر 1898ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ناول کی مقبولیت کے اسباب، اس کی فنی خصوصیات اور اس کی مختلف قسموں سے بحث کی ہے۔ یہ مضمون اس عہد کے تنقیدی معیار کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ انھوں نے مصنف کے خیالات، نظریات، ناول کے اجزا و عناصر، اس کے موضوع و مواد پر بحث کی ہے۔ ساتھ ہی اس وقت اس صنف کی ماہیت و مقصود کے تعین کی کوشش کی۔ جس وقت اردو تنقید بالخصوص افسانوی ادب کی تنقید اپنی ابتدائی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ یلدرم نے اس مضمون میں معتدل رویہ اپناتے ہوئے اپنے خیالات واضح انداز میں اور سادہ زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی وہ لکھتے

"مگر اس میں (ناول میں) اثر ڈالنے کے لیے،
ناول نویس کو قدم قدم پر ایک بہت بڑی بات کا
خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی مافوق العادت
واقعہ قصہ میں نہ بیان ہو جائے۔ (کہ) موجودہ
زمانہ کا قصہ پڑھنے والا ایک عجیب اتفاقِ شخص

بڑا فرق انگریزی اور اردو قصوں میں یہ ہے کہ ان
میں جب عشق کا سلسلہ چلتا ہے تو بالکل نیچرل معلوم
ہوتا ہے اور اردو میں از سر تا پا بے جوڑ۔ پرانے
قصوں میں تو کوئی شہزادہ چھت پر سوتا ہوتا تھا اور
عاشق ہونے کے لیے کوئی پری اڑ کر آیا کرتی تھی
لیکن اب یہ مجبوری ضرورت زمانہ نے سوائے تصویر
کے یہ سب باتیں بند کر دی ہیں۔ اب یا تو تصویر
کے ذریعے یا اٹھتے بیٹھتے کوئی جھلک نظر پڑ جانے
سے عشق پیدا ہو جاتا ہے۔" (۷)

یہاں وہ عشق کا مہمل یا غیر فطری بیان اور دوسرا بیان عشق کا مرے سے اخراج چاہتے تھے۔ ساتھ ہی ان پر یہ اعتراض بھی ہوئے کہ وہ خود تو عشقیہ واقعت پر مبنی افسانے لکھتے ہیں لیکن عشق دنیا کو افسانے سے نکال دینے پر نذیر احمد کو سراہتے بھی ہیں۔ کردار نگاری کے متعلق یلدرم ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ملاحظہ ہو

"ایک اور بات جس کی طرف ہمارے ناول
نویسوں نے ابھی تک توجہ نہیں کی۔۔۔۔۔ یعنی یہ کہ
ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ امیر ہونا کوئی لازمی
شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعیم یافتہ بھی اتنا ہی
اچھا ہیرو ہو سکتا ہے جتنا کہ تعیم یافتہ یا امیر۔۔۔۔
مگر ہمارے ناول نویسوں نے خیال کر لیا کہ ہیرو

کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نجابت کی اعلیٰ خاندان
کا ہو، نواب زادہ ہو، شہزادہ ہو، یا ہر ماہ معقول
آمدنی رکھتا ہو۔ ابھی تک اردو میں غریبوں کی
زندگی کا نقشہ کھینچنا باقی ہے۔ اور یہ کہا جا
سکتا ہے کہ محض غریب لوگوں کی زندگی سے متعلق
ناول لکھے جائیں۔ یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے
جس پر ابھی تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔" (۱)

قابل ذکر بات ہے کہ جس شخص کو صرف رومان پرست اور ادب لطیف کا حامی کہا جاتا ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑنے سے بھی کئی سال قبل اس نظریہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ غریب اور غیر مہذب سمجھے جانے والے اشخاص کی زندگی پر ناول لکھے جا سکتے ہیں اور انھیں بطور ہیرو پیش کیا جا سکتا ہے۔

یلدرم نے اردو ٹائپ کے لیے ہمیشہ کوششیں کیں۔ زبان کی ترقی اور تہذیب کے متعلق وہ قدیم راستوں سے ہٹ کر آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ اردو زبان کی ترقی اور اس کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے اپنے خطبے کا ایک حصہ ٹائپ کی بحث کے لیے وقف کر دیا اور بحث کو یہاں تک پہنچایا کہ اردو زبان کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا جائے ملاحظہ ہو

"ہندوستانی اکیڈمی نے مجھے اس جلسہ کا صدر قرار
دے کر اپنی توہین کی اور مجھے عزت بخشی۔ توہین سے

آپ سزاوار ہیں، اس عزت کا میں مستحق نہیں!

جب تک آپ لیتھوں کے شکنجے سے اخبارات، اپنی کتابوں کو آزاد نہ کریں گے، میری رائے میں اردو پوری ترقی نہیں کر سکتی۔۔۔۔ سوائے ہندوستان کے اور ہندوستان میں بھی سوائے اردو کے کہیں اخبار اور کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں۔ ایران مصر، ترکی، عربستان اور تو اور افغانستان، تمام ممالک نے لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کر دی۔۔۔۔۔۔ ہمارا ہندوستان، میں نے غلط کہا، ہماری اردو ابھی تک پتھر ہی کے زمانے میں ہے، اس سے آگے نہیں بڑھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ ایک اور خیال میں نے بارہا آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔۔۔۔ اب پھر آپ کو بور کرنے اور آپ کے دردِ سر کا باعث ہونے کے لیے میں اس راگ کو الاپتا ہوں۔ لیکن اس مرتبہ میری ہمت بڑھی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ نہایت مختصر طور سے یہ عرض کر دوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ "ترکی" کی طرح قانوناً "ہندوستانی" کا فارسی حروف یا ناگری حروف

بیان کی دل فریب پرچھائیاں چوری کے مال کی
طرح میری سرہ میں آتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ
آج تک بھی میری تحریروں میں سجاد کے انداز بیان
سے میری ابتدائی خوشہ چینی کا اثر باقی ہے۔ اس لیے
میں کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی ادیبانہ زندگی کے نقوش
کو۔۔۔۔ جس سے یہ انتساب میرے لئے قابل
فخر ہے۔۔۔۔ منظر عام پر پیش کر کے میں محبت اور
عقیدت کا ایک فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرتا
ہوں۔ یہ مضمون اُس قرضہ کی پہلی قسط ہے ممکن ہے
کہ یہی مضمون یلدرم کے کسی سوانح نگار کے لئے
ایک پیش لفظ بن جائے۔" (۱۰)

یہاں پر یلدرم کے ایک مضمون کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ جو انھوں نے 1903ء میں اقبالؔ پر لکھا تھا کہ ہمیں خوشی اور کشادہ دلی سے ماننا چاہیے کہ اردو کو یہ نیا شاعر ملا جس کی آواز ہمیں ہر روز لطیف اور شیریں نغمہ سناتی ہے اور جس کا تخیل ہر لمحہ بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ان لوگوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں جنھوں نے اقبالؔ کے کلام میں زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ یہ مضمون انھوں "ایک نیا ستارہ۔۔۔ اقبالؔ" کے نام سے لکھا تھا۔ ڈاکٹر اصغر عباس لکھتے ہیں

"اقبالؔ کی شاعری کے اولین زمانے میں اہل زبان
ان کے کلام میں زبان کی خامیوں پر نکتہ چینی کرتے

اور محاورے کی غلطیوں کو اچھال اچھال کر خوش
ہوتے۔اس وقت غالباً سب سے پہلے سجاد حیدر کی
قدر شناس نگاہوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو
بے نقاب دیکھا۔جہاں تک میرے علم میں ہے
1903ء میں مندرجہ بالا تحریر کی اشاعت سے
اقبال کی شاعری کے افکار و عزائم پر غور و خوض کا آغاز
ہوتا ہے۔مولانا محمد علی،عبدالرحمن بجنوری،مولوی
عبدالرزاق، مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہ (جو
سب کے سب علی گڑھ کے ہیں) کے مضامین اس کے
بعد کے ہیں۔" (۱۱)

انھوں نے ایک تعزیتی مضمون سرسید پر بھی لکھا جو "سرسید کی قبر پر" کے
عنوان سے رسالہ "اولڈ بوائے" بنارس میں مئی 1912ء میں شائع ہوا۔اس مضمون
کے لیے یلدرم نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو عام نہیں ہیں لیکن ان کا انداز بیان
اتنا سلیس و رواں ہے کہ قاری ان کے احساسات کو پوری طرح محسوس کرتا ہے۔الفاظ
کا استعمال اور اس کی ترتیب کا یلدرم بہت خیال رکھتے تھے۔اس مضمون میں شامل ان
افکار پر غور کیجیے جن میں یلدرم کی روح بے چین و بے قرار نظر آتی ہے۔ملاحظہ کیجیے

"مجھے اعتراف کرنا ہے۔حرصِ جاہ و مال و ہوس
نفس سے مغلوب ہو کر وہ شعلہ جو مجھ میں بھی۔۔۔
اور یہ زندگی کے علوی لمحے ہوتے ہیں۔۔۔تیزی

سے بھڑکتا ہے افسوس کہ اثر۔۔ اور جس زمین سے
ہم مربوط ہیں اس زمین میں وہ بیشتر مشتعل ہی ہے
۔۔ بہت دھیما رہتا ہے۔ گو شرر ہے کہ بجھتا نہیں اور
خدا کرے کہ جس دن یہ شعلہ قلب میری بے حسی
سے بجھے اس دن بعد اسی لمحہ یہ شمع حیات بھی گل ہو
جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ شعلہ پیدا ہوتی نور
مجھے چھوڑے جا رہا ہے، مجھے خود اس کا احساس ہو رہا
ہے۔ یہ ملوث محیط جس میں میں تیر رہا ہوں زیادہ
کثیف زیادہ غلیظ ہوتا جا رہا ہے! واعظ کا وعظ اور
رقیب کی زبان انگیز صدا میرے پاس سے اثر کے
بغیر گزر جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔" (۱۴)

سجاد حیدر یلدرم کے چند مضامین ایسے ہیں جس میں ان کے افکار و خیالات میں ہمیں ایک ترقی پسند ادیب سانس لیتا نظر آتا ہے۔ مضمون "مصاحبہ ادبیہ (Literary Gossip)" 1906ء ان ادیبوں اور شاعروں پر طنز ہے جو پرانی روایت کے دلدادہ ہیں۔ یہ لوگ نئے زمانے میں قدم رکھ چکے تھے لیکن اپنی تخلیقات میں کوئی جدت پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ مضمون ان لوگوں پر طنز ہے جو اپنی زندگی گزار چکے تھے اور حسرت سے پرانے زمانے کو یاد کرنے میں وقت برباد کر رہے تھے یلدرم ان کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ جو بیت گیا سو بیت گیا آہیں بھرنے کے بجائے ہمیں آج کی حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ وقت کے ساتھ خود کو بدلنا ہی وقت کا تقاضہ

ہوتا ہے ورنہ تیز رفتاری سے گزرتا ہوا وقت ہمیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتداء میں قوم جن مشکلات سے گزر رہی تھی اس سے ان کا دل کڑھتا تھا۔ اپنے خیالات کا اظہار ایک مضمون ''میرے بعد'' میں اس طرح کرتے ہیں

> ''دنیا کی خوشی میں، سعادت و رفاہیت میں، اضافہ نہیں ہوگا مگر اندوہ غم میں کمی ہو جائیگی ایک غم آگیں دل ایک محبت آلود وجود دنیا سے اٹھ جائیگا۔ سفاکات و رذالت، تحکم و تیش کی جنگ جاری رہیگی۔ مگر دنیا کے لئے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائیگا!'' (۱۳)

مضمون ''میرے بعد'' ظہراد بے ہور سالہ ''تمدن'' لکھنو میں اکتوبر 1915ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح ''ویران صنم خانے'' کے عنوان سے زندگی کے حقائق کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں اور اپنے وجدان کا مشکل راستہ طے کر کے فکری اس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں بے حقیقت زندگی ان کو مایوس کر دیتی ہے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو

> ''طفلی و عشق کی ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا۔ افکار و احساسات کے نادیدہ افقون کی طرف زندگی ڈراونی تیزی کے ساتھ مجھے لے گئی اور میں نے دوسروں کے معبد کے دروازوں میں

سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہ نے نہایت گہرے
پردوں میں سے گزر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ
ویران معبدوں کے سوا کچھ نہیں۔ قلب نے بھی کہا
کہ میں کبھی تجلی گاہ ارمان تھا۔ کبھی! وہ علوم جس
کے لئے علماء سر کھپا رہے ہیں، وہ سوز گداز بشری
جس کی ترجمانی شعراء کرتے رہے ہیں، وہ دوستی، عشق،
دین، فکر بشر، سب کے سب آخر میں دیکھے تو ویران
معبد ہی نظر آئے۔ دماغ و قلب کے ویران صنم
خانے!

اب ان میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے
ہیں!" (۱۴)

اسی طرح محترمہ زاہدہ خاتون شیروانی کے انتقال پر یلدرم نے ایک نثری مرثیہ لکھا۔ جو رسالہ "ہمایوں" میں 1921ء میں شائع ہوا تھا۔ محترمہ ز۔خ۔ش صاحبہ علی گڑھ کے مشہور شیروانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور تعلیم نسواں کی بڑی حامی تھیں۔ ان کی بے وقت موت سے جہاں یلدرم کا حساس دل تلملا اٹھا وہیں ان کی موت سے اردو ادب کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ وہ ایک ادب نواز خاتون تھیں۔ محترمہ ز۔خ۔ش نواب سر مزمل اللہ خان بہادر او بی ای کے سی آئی ای رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ یلدرم کے اس نثری مرثیہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے مرحومہ کی حیات اور تصانیف پر بہت کم الفاظ میں ایک مکمل تبصرہ دیا

ہے۔ جسے پر اثر بنانے کے لیے انھوں نے بندشوں کی چستی اور موزونیت، الفاظ کی برجستگی، عبارت کی بے ساختگی اور روانی کو ملحوظ رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو

"وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاش
نغمے اس کی قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کے ایک عالم
کو مسحور کر رہے تھے، یکا یک خاموش ہو گئی۔ نغمے
فضا میں منتشر ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ کے لیے
ساکت۔

وہ حقیقت راز گر شیریں آواز صدا پردۂ دولت
کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول
مکالمے کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سن رہی تھی کہ
صدق و صفا علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا
ہیں۔ اور صدق و صفا علم و عرفان، درد و گداز سوگوار
ہیں کہ ان کی مشاطہ ان کو دلآویز آرائشوں میں اب
پیش نہ کرے گی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی قفس
میں جی اور اس نے قفس میں ہی دم توڑا۔ اس چند گز
نیلگوں آسماں کے سوا جو اس کے صحن خانہ پر حسرت
بار رہا، اس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دست
انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دنیا کو زندگی

اور حرارت بخشتا ہے قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے
کپڑے سے گذر نہ سکا۔ لیکن خود اس کے قلب منور
نے ایک شمع روشن کی جس نے اسے باہر کے نور سے
بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل!" (۱۵)

یلدرم نے تراجم کے ذریعے اُردو ادب میں ایک طرح نو کی بنیاد ڈالی۔ اور پڑھنے والوں کے مخصوص حلقے کے ذہنوں کے لیے نئی اور تازہ غذا کا سامان مہیا کیا۔ ان تراجم کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جس کے ذریعے اُردو ادب میں ایک نئی راہ کی بنیاد پڑی ان تراجم میں کھلا پن تھا۔ انھوں نے ترکی ادب سے اصطلاحیں، نفسیاتی معاملات، فلیش بیک، علامتوں کے استعمال کو اپنایا لیکن ان میں ہندستانی ماحول اور یہاں کے فنی تقاضوں کو بھی انھوں نے نہایت خوبصورتی سے برتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو افسانہ نگاری میں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کا ایک نیا طریقہ دریافت ہوا۔ انھوں نے شروعات ہی میں اُردو افسانہ کو فنی الجھنوں کی کشمکش سے نکال کر احساسات و جذبات کی دنیا عطا کی۔

درحقیقت انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کی آمد ایک نئی دنیا قائم کر رہی تھی۔ اس وقت ملک میں پرانی قدریں مٹ رہی تھیں اور نئی قدریں اپنے قدم جمانے لگی تھیں۔ مسلمانوں کے جذبات و احساسات میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ مذہب، سیاست، قوم کے سوچنے کا انداز، ان کی ضرورتیں، سائنسی ایجادات ہر کوئی نئی سمت کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ یلدرم انھیں میں شامل تھے اور معاشرے کو نئے خیالات سے آشنا کرنے کے آرزومند تھے۔ علی گڑھ تحریک کی وجہ سے اُردو زبان تصنع اور مقفع و

مسجع عبارت سے پاک ہو گئی تھی۔ اردو زبان بے حد فعال ہو گئی تھی اور سائنسی نظریات عام ہو گئے تھی۔ یلدرم نے ان دونوں رویوں کو اپنے یہاں جگہ دی وہ بھی کچھ ایسے انداز میں کہ دونوں ادبی رویوں کی نمائندگی ہو سکے اور جو اردو ادب میں اضافے کا سبب بن سکے۔ انھوں نے ادب کو خشکی سے بچایا اور زبان میں رنگینی کو قائم رکھتے ہوئے اصلاحی اشاروں کے ذریعے قاری کو اپنی تحریروں کی گرفت میں لیا۔

تراجم شدہ اور طبعزاد افسانوں کے سبب یلدرم کی شہرت کا شہرہ چاروں طرف ہو گیا تھا اور یہ بحثیں سر اٹھانے لگی تھیں کہ یقیناً یلدرم ہی اردو افسانے کے موجد ہیں۔ اس وقت شمس العلماء تاجور نجیب آبادی نے انھیں "اردو کا ایڈگر ایلن پو" کا خطاب دیا۔ کیونکہ "Allan Poedgar" وہ پہلا شخص ہے جس کی وجہ سے مغرب میں افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ملاحظہ ہو

> "جس طرح دنیائے مغرب میں پو کو مختصر افسانہ نویسی کا "موجد" کہا گیا ہے، سید سجاد حیدر یلدرم اردو زبان میں طرز جدید کے مختصر افسانہ لکھنے والے پہلے شخص ہیں۔" (۱۶)

حقیقت پسندی اور قوم کی اصلاح کا سفر صرف یہی ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے طبعزاد افسانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ قوم کی حالت پر ان کا دل تڑپتا ہے اور "قوت" جیسا افسانہ وجود میں آتا ہے۔ افسانہ "قوت" اپریل 1923ء میں رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہوا تھا جو انھوں نے تمثیلی پیرائے میں لکھا ہے۔ یہ ایک ہجویہ تصنیف ہے جس میں طنز کی کاٹ بہت گہری ہے۔ یہ افسانہ زمانہ کے حالات پر ایک

تعریض ہے جس میں وہ ہندستان کے اس وقت کے حالات زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ اس افسانہ میں انھوں نے سماج میں پل رہی بربریت کو بیان کیا ہے کہ کس طرح امیر طبقہ کمزوروں کو اپنے ظلم کا شکار بناتا ہے۔ کمزور و ناتواں اپنے حق کے لئے لڑتے ہیں مگر ان کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ اس افسانے سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''عین اس وقت اس منظر کے اُوپر سے ایک کوا جس نے ایک آشیانہ شفقت میں گھس کر ابھی ابھی انڈوں کو پھوڑا تھا اور انھیں کھا کر شکم سیر ہوا تھا، مصنوعی فرار کے اندر سے گزر رہا تھا اور غیض مادرانہ میں بھری ہوئی ایک مینا، سادہ لوحی سے ٹھونگیں مارنے کی کوشش کر کر کے، قوت اور حیلہ کو اپنے زعم میں مجروح کر رہی تھی۔'' (۱۷)

اس افسانہ کے متعلق قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

> ''ان چند سطروں میں ہم ایک طعن آمیز تمثیل کا پیرایہ دیکھتے ہیں۔ ان کے قلم کے کانٹوں کے نوک پر ہمیں اُن کے خونِ دل کی سرخی نظر آتی ہے! ۲۳ء ہندوستان کے گزرے ہوئے دس بارہ سال کی روداد کی طرف یہ ایک طنز آمیز اشارہ ہے اُس عجز اور بے کسی کی حالت کی طرف جس حالت میں وہ

شاید خود اپنے وجود معنوی کو بھی دیکھ رہے۔ اس
تمثال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سجاد کی روش آتش دان
ملکی سیاسی کشمکش سے بہت دور رہ کر بھی حق
قریب تھی۔" (۱۸)

یلدرم افسانہ نگاری کے رموز و فن سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی تحقیقات میں وہ اس خیال کی پوری طرح تصویر کشی کرتے ہیں جو ان کے فکر سے وابستہ تھی۔ پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اسی منظر کا ایک حصہ ہے۔ "ہجوم میں تنہائی" بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں مصنف نے جس کمال کی منظر کشی کی ہے۔ ملاحظہ ہو

"دوست سے دوست، محبوبہ عاشق سے یا
بالعکس عاشق محبوبہ سے جدا ہو رہا ہے۔ ہار پہنائے
جا رہے ہیں۔ گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لنگر
اٹھا۔ جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے ہٹنا شروع ہوا۔
رخصت کرنے والوں کی ساحل اور اس پر صفیں
کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں،
کبھی ہلتے ہیں۔ کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو
ساحل پر بلا رہا ہے۔ جانے والا ساحل کے دوست
کو اشارے سے ڈک پر آنے کی دعوت دیتا
ہے۔ پرشہ وداع، حزین فراق دونوں یہاں موجود

ہیں۔ جہاں ہر طرف مصافحے، معانقے ہو رہے
ہوں، وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی دل پر عجیب
اثر کرتا ہے۔میں ہجوم میں تنہا ہوں۔'' (۱۹)

زبان و بیان پر یلدرم کو عبور حاصل تھا۔ان کی تحریروں میں مقصد، اصلاح اور حقیقت نگاری ملتی ہے۔جس وقت یلدرم نے اُردو ادب میں ترکی ادب کو شامل کرنا شروع کیا اس وقت اور بھی دانشور ترکی کی سیاسی، مذہبی، علمی اور ثقافتی سطح پر ہونے والی ترقی پر نظر رکھ رہے تھے لیکن یلدرم نے ترکی میں اسلام کی جو پختگی اور ترقی یافتہ شکل کو محسوس کیا اسے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نہ صرف ترکی بلکہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے شاہکار تخلیقات کا اُردو زبان میں ترجمہ کر کے اپنے خیالات میں پختگی پیدا کی۔ یلدرم عورتوں کی تعلیم و تربیت کے حامی تھے۔وہ عورت کو پردے کے پیچھے سے جھانکنے والی یا چار دیواری میں قید نہیں دیکھنا چاہتے تھے ان کا ماننا تھا عورت سے ایک تہذیب وابستہ ہوتی ہے لہذا انھیں مساوی درجہ دینا ضروری خیال کرتے تھے۔سماج میں عورتوں کے استحصال کو روکنے اور اس کے ساتھ ہو رہے غیر ذمہ دارانہ حرکت کے خلاف یلدرم نے سب سے پہلے قلم اُٹھایا اور عورتوں کے بنیادی حق اور مسائل کو اجاگر کیا۔

یلدرم سے پہلے افسانہ ناول کے ہی معنوں میں استعمال کیا جا رہا تھا۔ انگریزی اصطلاح Short Story کا ترجمہ ''مختصر افسانہ'' کے طور پر لیا گیا تھا۔ بقول ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ:

''یلدرم کی کہانیاں پہلی بار ''قصہ'' کے بجائے

"افسانہ" کہلائیں۔" (۴۰)

اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں

"اردو مضمون نگاری کا یہ پہلو تعجب خیز ہے کہ ابتداء میں اس فن کو علی گڑھ کے نئے ماحول اور پر مسرت زندگی اور رومان پرور فضاؤں نے اسے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا موقع دیا۔ چنانچہ اردو کا اولین اور غالباً عظیم ترین مضمون نگار بھی علی گڑھ کی ناک سے پیدا ہوا۔ اور وہ سجاد حیدر یلدرمؔ تھا۔ اب وقت آ گیا تھا جب علی گڑھ کے فنکاروں کے سامنے صرف سرسید کے نمونے ہی نہ تھے بلکہ مشرقی اور خصوصاً انگریزی کے بڑے بڑے نادر شاہکار نظر افروز اور دلفریب ثابت ہو رہے تھے۔ یلدرمؔ نہ صرف انگریزی سے بہرور ہو تھے انہیں ترکی ادب سے بھی واقفیت اور دلچسپی تھی۔ ان سب باغوں سے انہوں نے پھول چنے اور خیالستان کے گل وگلزار کھلائے۔ یہ پھول اگرچہ دوسرے دیس کا رنگ ڈھنگ رکھتے ہیں مگر ان کا مالی سرسید کے گھرانے کا فرد ہے۔ اس لئے ان گلدستوں کے لئے بھی اردو والے اسی باغبانِ اعظم

کے مرہون منت ہیں۔" (۲۱)

اگر غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ یلدرم وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو ادب میں تہذیب کی کڑی کو سماجی زندگی سے متعارف کرایا۔ قاضی عبدالغفار، یلدرم کی اس انفرادیت کو ترقی پسندی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"سجاد ایک ترقی پسند ادیب تھے! ۔۔۔۔۔ کیا یہ
کوئی عجیب دعویٰ ہے؟ بلاشبہ ترقی پسندی کے صحیح
مفہوم کے اندر سجاد کا انداز نگارش "ترقی پسند" تھا۔
انھوں نے اُردو ادب کو ترکی کے ترقی پسند رجحانات
سے متاثر کرکے قدامت کی زنجیریں توڑ دیں۔۔۔
۔۔۔۔ نہ صرف انشاء پردازی کے اعتبار سے بلکہ
مطلب کے اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے پڑھنے
والوں کو ترقی پسندی کا پیام دیا۔ اُن کے افسانوں
کے تمام موضوعات بھی ایسے ہی ہیں اور خود اُردو
زبان کے متعلق بھی ان کے خیالات نے قدامت
پسندی کی حدود کو توڑ دیا تھا۔ زبان کی ترقی اور
تہذیب کے متعلق وہ قدیم راستوں سے ہٹ کر
آگے بڑھنا چاہتے تھے۔" (۲۲)

اُردو افسانہ نگاری میں کلمہ ہائے تاسف کا استعمال بھی یلدرم ہی کی دین ہے انھوں نے اپنے افسانوں خواہ ترجمہ ہو یا طبعزاد آہ، اُف، اوہ اور اے وغیرہ کا استعمال

نے ایک خاص فضا قائم کی۔ جس کو پڑھ کر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کلمہ ہائے تاسف کا استعمال حالانکہ غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے لیکن افسانوں میں سب سے پہلے یلدرم ہی نے اسے برتا۔ انھوں نے نہ صرف نئے تصورات کو اردو نثر میں رائج کیا بلکہ طرز تحریر میں بھی انوکھے طرز نگارش تخلیق کیں۔

یلدرم کو جس انداز بیان یا مخصوص اسلوب نگارش کی وجہ سے ''ادب لطیف'' کا ترجمان اور ''رومانیت'' سے جوڑا گیا آیئے دیکھتے ہیں ادب لطیف آخر کیا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ لکھنے والا بھی یہ نہیں سوچ کر لکھتا کہ وہ رومانی انداز میں لکھے گا یا کلاسیکی انداز میں۔ ادیب کی بنیادی ضرورت کسی بھی موضوع کے تحت لکھنا ہوتا ہے۔ اور وہ لکھ دیتا ہے۔ یہ نقادوں کی آرا ہوتی ہے جو بعد ازاں اس کے ادب کا جائزہ لے کر ایک رجحان قائم کر لیتے ہیں۔ دراصل رومانیت ایک تنقیدی اصطلاح ہے جو انگریزی کی اصطلاح Romanticism کا ترجمہ ہے۔ عام طور سے رومانیت کو کلاسیکیت کے متضاد کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور یہ دونوں مغربی ادب میں مروج اور مقبول رہی رہیں۔ سترھویں صدی کے اواخر میں یہ اصطلاح فرانس پہنچی اور یہاں اسے مقبولیت نصیب ہوئی۔ یہ لفظ فرانس سے پہلے جرمنوں کے ہاں پہنچ چکا تھا۔ اس اصطلاح کی صفات بیان کرتے ہوئے شارب ردولوی لکھتے ہیں

> ''جس کے عام معنی رومانس عشق و محبت ناول کے ہیں۔ اس کو عام عشقیہ قصوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ان قصوں سے مراد عہد وسطیٰ کی پر شکوہ عشق و محبت کی داستانیں نہیں ہیں۔ لیکن اس

لفظ کے معنی غیر مہذب یا علم زبان کے لئے بھی لئے
جاتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا دوسرا استعمال یا مفہوم
ان زبانوں میں سے کسی زبان کی ایسی کہانیوں کے
لئے ہوتا ہے۔ یا کوئی خیالی افسانہ یا ناول جس کی
بنیادی زندگی اور اس کی حقیقتوں سے بعید ہو یا خیالی یا
تصوراتی نظم یا نثر اور حقیقت سے پرے مبالغہ آرائی
عشق و محبت کے معاملہ تخیل پرستی اور رنگ آمیزی
ہو۔" (۲۳)

اُردو رومانیت کی تفسیر یہ ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اُردو ادب میں جنم لینے والی رومانی تحریک کا رومانیت سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟ یا محض اصطلاحات کی سی طمطراقی کی بدولت ہم نے اسے رومانیت سے وابستہ کر دیا ہے۔ اسی بات پر مدلل بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں

"اُردو تنقید کا انحصار، انگریزی نظریات اور ان سے
وابستہ اصطلاحات کی جگالی پر ہے۔ اس نے اُردو
تنقید میں رومان اور رومانی جیسی اصطلاحات نے
کافی سے زیادہ اُلجھنیں پیدا کی ہیں۔ اسی لیے اختر
شیرانی شاعر رومان ہیں تو سجاد حیدر یلدرم رومانی
افسانہ نگار، جبکہ نیاز فتح پوری رومانی نقاد
کہلایا۔۔۔۔۔ ان پر یہ لیبل اتنی مدت سے چسپاں

کیے جا چکے ہیں کہ کبھی کبھی تو شک ہونے لگتا ہے
کہ کہیں واقعی یہ ایسے ہی نہ ہوں۔ یہی نہیں بلکہ
مختلف ناقدین نے بقدر ظرف غالب، اقبال اور
فیض وغیرہ میں بھی رومانی عناصر ''دریافت'' کر
رکھے ہیں۔'' (۲۴)

یلدرم کی تخلیقات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کے یہاں عورت، اپنی تمام تر مقصدیت اور معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی جذباتیت اور تخیل کی پرواز میں ایک مقصد کارفرما ہے۔ ان کی تحریروں میں انفرادیت پسندی کی وہ جھلک ملتی ہے جو بائرن کے یہاں ملتی ہے یا پھر جو ابوالکلام آزاد کے پاس نظر آتی ہے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''یلدرم کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ افسانے میں اسرار کی
قیمت سے آگاہ تھے اور فن کو باطن کی اس دنیا کا
آئینہ خانہ بنانا چاہتے تھے جس سے ہماری شناسائی
اس وقت تک بہت محدود تھی۔ انھوں نے اُردو کے
داستانوی ادب سے بڑھ کر حقیقی زندگی کے مناسبت
کی روشنی میں تخیل کی تربیت کے واسطے سے انسانی
عینیت کے ذوقی اور وجدانی عنصر کی حفاظت پر زور
دیا، اس ننھے سے نقطے میں ان کی اخلاقیات اور
تہذیبی مقاصد کی دنیا بھی روپوش ہیں۔۔'' (۲۵)

یلدرم نے علمی و ادبی اور فکری ماحول میں تربیت پائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ تحریک کے دوران وہ سرسید تحریک کی اصلاح پسندی اور مقصدیت سے کافی حد تک متاثر تھے لیکن سرسید کی خشک تعقل پسندی کے برعکس، وہ چند حقیقتوں کو بھی زندگی کا اہم حصہ سمجھتے تھے۔ جن کے بغیر زندگی میں توازن قائم کرنا بہت مشکل ہے یہ وہ حقیقتیں تھی جن میں جذباتی مسائل اور فرد کے داخلی معاملات شامل تھے۔ یلدرم نے معاشرتی مسائل سے پیدا شدہ تضادات کے پہلوؤں کو، جو فرد کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اپنا موضوع بنایا۔ یلدرم نے اردو ادب کو تعلیم یافتہ عورت سے متعارف کرایا وہ بھی لطافت اور زندگی کے صحت مند انداز میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''عورت اور جنس کے بارے میں بعض تصورات پر
> پابندی کی وجہ سے ہم نے بہت سی ایسی بھی تمیں
> فراموش کردیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے بزرگوں
> کو شعور میں جا گزیں تھیں اور جنھیں بہت بعد میں محمد
> حسن عسکری، منٹو اور عصمت نے دوبارہ دریافت
> کیا۔ یلدرم کے یہاں ان باتوں کا بڑا احساس
> ملتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی بعض افسانوی تحریریں
> مجھے آج بھی زندہ معلوم ہوتی ہیں۔'' (۲۶)

سجاد حیدر یلدرم کے ادبی کارناموں، ان کے نظریات اور افکار کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو ادب کے ایک ایسے نثر نگار تھے جس نے اردو ادب کو عصر سے

مقابل اس طرح کھڑا کیا کہ اردو زبان مغرب کے کسی بھی ادب کے مقابل اپنے ادب کو کھڑا کر سکتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ یلدرم ہی تھے جنھوں نے عام آدمی کی ادب میں شمولیت پر زور دیا۔ انھوں نے خواتین کو چار دیواری سے باہر نکل کر علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب کو مختصر افسانے سے روشناس کرایا بلکہ اس کے موضوعات اور اس کی فنی خوبیوں کی طرف بھی نشان دہی کی۔ لیکن افسوس یہ تو ہم نے سجاد حیدر یلدرم کے افکار و نظریات کو پڑھا ہی نہیں یا ان کے ادب کا پوری جامعیت کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ ہاں ہم نے اتنا ضرور کیا کہ ان کے قد کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

لیکن آج چونکہ تحقیق و تنقید کی راہیں کھلتی جا رہی ہیں۔ اس لیے قوی اُمید ہے کہ اردو داں طبقہ ان کے ساتھ انصاف کرے گا۔

حواشی

۱۔ اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند جین ص 91

۲۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، "باغ و بہار" مشمولہ "1985ء کے بہترین مقالے" مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، البیان، لاہور طبع اول 1966ء

۳۔ سر سید اور مغرب کے تہذیبی اثرات از آل احمد سرور علی گڑھ نمبر ص 73

۴۔ تنقیدی مباحث از پروفیسر شارب ردولوی ص 215

۵۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن ص 24

۶۔ ابوبکر عباد "رومان پسند انقلابی نقاد" ماہنامہ "اردو دنیا" شمارہ اکتوبر 2008 نئی دہلی

یلدرم نے علمی و ادبی اور فکری ماحول میں تربیت پائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ تحریک کے دوران وہ سر سید تحریک کی اصلاح پسندی اور مقصدیت سے کافی حد تک متاثر تھے لیکن سر سید کی خشک تعقل پسندی کے برعکس وہ چند حقیقتوں کو بھی زندگی کا اہم حصہ سمجھتے تھے۔ جن کے بغیر زندگی میں توازن قائم کرنا بہت مشکل ہے یہ وہ حقیقتیں تھی جن میں جذباتی مسائل اور فرد کے داخلی معاملات شامل تھے۔ یلدرم نے معاشرتی مسائل سے پیدا شدہ تضادات کے پہلوؤں کو، جو فرد کی داخلی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اپنا موضوع بنایا۔ یلدرم نے اردو ادب کو تعلیم یافتہ عورت سے متعارف کرایا وہ بھی لطافت اور زندگی کے صحت مند انداز میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''عورت اور جنس کے بارے میں بعض تصورات پر
> پابندی کی وجہ سے ہم نے بہت سی ایسی بصیرتیں
> فراموش کر دیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے بزرگوں
> کو شعور میں جا گزیں تھیں اور جنہیں بہت بعد میں محمد
> حسن عسکری، منٹو اور عصمت نے دوبارہ دریافت
> کیا۔ یلدرم کے یہاں ان بصیرتوں کا ہلکا سا احساس
> ملتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی بعض افسانوی تحریریں
> مجھے آج بھی زندہ معلوم ہوتی ہیں۔'' (۲۶)

سجاد حیدر یلدرم کے ادبی کارناموں، ان کے نظریات اور افکار کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو ادب کے ایک ایسے شناور تھے جس نے اردو ادب کو عصر کے

مقابل اس طرح کھڑا کیا کہ اردو زبان مغرب کے کسی بھی ادب کے مقابل اپنے ادب کو کھڑا کر سکتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ یلدرم ہی تھے جنھوں نے عام آدمی کی ادب میں شمولیت پر زور دیا۔ انھوں نے خواتین کو چار دیواری سے باہر نکل کر علم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو ادب کو مختصر افسانے سے روشناس کرایا بلکہ اس کے موضوعات اور اس کی فنی خوبیوں کی طرف بھی نشان دہی کی۔ لیکن افسوس یا تو ہم نے سجاد حیدر یلدرم کے افکار و نظریات کو پڑھا ہی نہیں یا ان کے ادب کا پوری جامعیت کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ ہاں ہم نے اتنا ضرور کیا کہ ان کے قد کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

لیکن آج چونکہ تحقیق و تنقید کی راہیں کھلتی جاری ہیں۔ اس لیے قوی اُمید ہے کہ اردو داں طبقہ ان کے ساتھ انصاف کرے گا۔

حواشی

۱۔ اردو کی نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند جین ص 91

۲۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، "باغ و بہار" مشمولہ "1985ء کے بہترین مقالے" مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، البیان، لاہور طبع اوّل 1966ء

۳۔ سرسید اور مغرب کے تہذیبی اثرات از آل احمد سرور علی گڑھ نمبر ص 73

۴۔ تنقیدی مباحث از پروفیسر شارب ردولوی ص 215

۵۔ اردو ادب میں رومانوی تحریک از ڈاکٹر محمد حسن ص 24

۶۔ ابوبکر عماد "رومان پسند انقلابی نقاد" ماہ نامہ "اردو دنیا" شمارہ اکتوبر 2008 نئی دہلی

ص 12

۷۔ایضاً ص 13

۸۔کار جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر ص 124

۹۔ایضاً ص 360-357-348

۱۰۔قاضی عبدالغفار ''سجاد۔۔۔یلدرم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 30 ۔ 29

۱۱۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 94 - 93

۱۲۔قاضی عبدالغفار ''سجاد۔۔۔یلدرم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 38 - 37

۱۳۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 92

۱۴۔سجاد حیدر یلدرم مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 39 - 38

۱۵۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 211 - 210

۱۶۔شمس العلماء تاجور نجیب آبادی ''اردو کا الن پو'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 105

۱۷۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 212

۱۸۔قاضی عبدالغفار ''سجاد۔۔۔یلدرم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 42

۱۹۔سجاد حیدر یلدرم مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 84

۲۰۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 50

۲۱۔ایضاً ص50

۲۲۔قاضی عبدالغفار "سجاد۔۔۔یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتب سید مبارز الدین رفعت ص60 - 56

۲۳۔جدید اردو تنقید از شارب ردولوی ص78

۲۴۔تنقیدی دبستان از ڈاکٹر سلیم اختر ص48 - 47

۲۵۔کہانی کے پانچ رنگ از شمیم حنفی ص36

۲۶۔افسانے کی حمایت میں از شمس الرحمن فاروقی ص188 - 187

☆☆☆

باب دوم

سجاد حیدر یلدرم کی زندگی

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

(اقبالؔ)

اردو ادب کے اس بیکراں سمندر میں ہر روز ایک فنکار جنم لیتا ہے اور ایک ڈوبتا ہے۔ شہرت کی بلندیوں تک صرف وہی پہنچ پاتے ہیں جس کا فن قارئین کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم ایسی ہی ایک شخصیت ہے جنھوں نے اپنے وقت میں لاکھوں، کروڑوں دلوں پر اپنے فن کے ذریعے حکمرانی کی ہے۔ لیکن افسوس آج اس قابل قدر ہستی کو بھلا دیا گیا ہے۔ آیئے اب ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔

پیدائش:

سجاد حیدر یلدرم کی پیدائش اس وقت ہوئی جب اس ملک میں بڑے بڑے سیاسی و قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عالموں نے جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ آزادی کی پہلی لڑائی (1857ء) کی ہار سے مسلم طبقہ انتشار زدہ تھا اور ان کی جاگیریں ضبط ہو چکی تھی۔ اس دور میں سرسید اور ان کے حامیوں نے انتشار کی شکار قوم کو سمیٹنا شروع کیا اور انھیں مغربی علوم کے حصول کی طرف موڑ کر ایک نئے طرز معاشرت سے روشناس کرایا۔

1880ء میں موضع نہوڑ ضلع بجنور میں یلدرم کی پیدائش ہوئی۔ یلدرم نے اپنی پیدائش کا مقام ہمیشہ موضع نہوڑ بتایا ہے جہاں کی ان کے خاندان کو جاگیریں عطا ہوئی تھیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر، یلدرم کا مقام پیدائش کانڈیر، ضلع جھانسی بتاتی ہیں۔ والدین نے ان کا نام سید سجاد حیدر رکھا۔ وہ خاندانی کھرے سید تھے۔ انھوں نے ادبی سفر کے آغاز میں اپنے مضامین ''سجاد حیدر'' کے نام سے لکھے لیکن ملازمت کے سلسلے میں جب بغداد میں قیام کیا اس وقت قلمی نام ''یلدرم'' اختیار کر لیا۔ ''یلدرم'' ایک ترکی لفظ ہے جو مشہور ترکی سلطان بایزید کا لقب تھا۔ چونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر اس تیزی سے آگرتا تھا کہ لوگ اسے ''یلدرم'' کہتے تھے۔ ''یلدرم'' کے معنی ''برق'' کے ہیں۔ لیکن سجاد حیدر کا مزاج اس کے منافی تھا۔ اس سلسلے میں مشتاق احمد زاہدی لکھتے ہیں

> ''یلدرم ایک ترکی لفظ ہے۔ جس کے معنی ''برق'' کے ہیں۔ اس لفظ کے تلفظ کی آواز پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ یلدرم کے معنی گرج یا بادل کے گڑگڑانے کے ہونگے نہ کے محض برق کی چمک کے۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا۔ اس لئے سجاد صاحب سے میں نے اس کی تصدیق نہ کی۔ اگر اس لفظ کے معنی گرج کے لئے جائیں تو ''یلدرم'' سجاد کے نام کے ساتھ ہرگز موزون نہ تھا۔ کیونکہ وہ خیالات کی بارش ضرور کرتے رہے۔ مگر کبھی گرجے

نہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے یلدرم انھوں نے
اپنے اشعار یا نظموں میں بہ طور تخلص کے کبھی
استعمال نہیں کیا۔" (۱)

اردو ادب میں سجاد حیدر نے کئی نئی چیزوں کا اضافہ کیا ہے جس میں سے ایک قلمی نام بھی ہے۔ بقول پطرس:

"انھوں نے ایک ترکی قلمی نام "یلدرم" اختیار کیا
جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنیاد
ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک
علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔" (۲)

چونکہ سجاد حیدر سرکاری ملازم تھے۔ لہذا برٹش سرکار کے خلاف کھل کر نہیں لکھ سکتے تھے اس لئے انھوں نے اپنے چند مضامین "خافی خان" اور "مسز شاد ی بیگ" کے نام سے بھی شائع کیے۔ سجاد حیدر نے قلمی نام اختیار کرنے میں بھی جدت دکھائی وہ اس طور سے کہ پھر کوئی دوسرا اس تخلص کا حقدار نہ ہوا۔ سید اظہر احسن لکھتے ہیں:

"میر سوز مرحوم نے ایک دفعہ شاعروں کی کثرت
کے سلسلے میں کہا تھا کہ
ڈھونڈتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں
سید صاحب نے اس مقولہ کو بالکل غلط ثابت کر دیا
ہے کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا کہ اردو کے کسی

اور شاعر کا تخلص یلدرم ہوا اس سے آپ کی جدت
پسندی کے علاوہ اس شغف کا بھی اظہار ہوتا ہے جو
آپ کو ترکی زبان و ادب سے ہے۔'' (۳)

خاندانی پس منظر:

سید سجاد حیدر یلدرم کا شجرہ نسب حضرت علیؓ کی تیسری نسل حضرت زید شہید
بن زین العابدینؓ سے جا کر ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

''سلسلہ نسب پدری سید عالی خاندان سید کمال
الدین ترمذی کہ در کیتھل متصل تھا۔ نیسر از ولایت
آمدہ سکونت کردہ اند بن سید عثمان ترمذی بن سید
ابوبکر بن سید عبداللہ بن سید طاہر بن ابو طاہر بن سید
عبداللہ بن سید علی زید بن سید حسین بن ابو عبداللہ
بن سید احمد محدث بن سید عمر بن سید حسین ذوالدمعہ
بن زید شہید بن زین العابدین علیہ السلام۔'' (۴)

خلیفۂ وقت نے جب حضرت زید بن زین العابدینؓ کو شہید کر دیا تب ان کی
اولاد نے مزید ظلم سہنے سے بچنے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا اور جا بجا منتقل ہو گئے۔ ان
میں چند افراد نے جن میں سید حسن ابو عبداللہ محدث شامل تھے ترمذ میں پناہ لی اور پھر
یہی سلسلہ ترکمانیہ سے ہند تک پھیلتا چلا گیا۔ یلدرم کے جد امجد کمال الدین ترمذی
1180ء میں ترکمانیہ چھوڑ کر ہند چلے آئے اور قصبہ کیتھل ضلع ہریانہ میں سکونت

اختیار کی۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد اپنے والد سے ملنے کی خاطر دوبارہ ترکستان گئے اور 1192ء میں اپنے بیوی، بچوں اور رفقاء کے ساتھ دوبارہ ہندوستان لوٹ آئے۔ سید کمال الدین کے تمام حالات "ملفوظات کمالیہ" اور "الدر المنظوم" میں درج ہیں۔

سید کمال الدین ترمذی کے اولادوں میں سے چند نے روہیل کھنڈ اور کچھ نے نہور ضلع بجنور میں سکونت اختیار کی۔ نہور میں آ کر بسنے والوں میں سے یلدرم کے نگر سگر دادا سید حسن ترمذی بھی تھے۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا ستارہ عروج پر تھا لہذا یہ خاندان بھی مغلیہ دربار سے وابستہ ہو گیا اور ان کے حصہ میں سہ ہزاری، پنج ہزاری و منصبداری آئی۔ ان لوگوں کی تہذیب اور شرافت نفس کا ہر کوئی قائل تھا۔ صدیوں سے اس گھرانے میں نسل در نسل علم کی تعلیم منتقل ہوتی جا رہی تھی۔ سبھی لوگ اپنے وقت کے بڑے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ لوگ روایتی مولویوں میں سے نہیں تھے بلکہ علمیت کے ساتھ ان لوگوں میں زندگی کی لہر بھی قائم تھی۔ اس گھرانے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی خواتین بھی تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

سید میر حسن ترمذی کے بچوں میں بی النساء، اللہ بندی، علی بخش، میر بندے علی اور میر احمد علی (یلدرم کے دادا) شامل ہیں۔ ان بچوں نے جیسے ہی ہوش سنبھالا اپنے نام کے ساتھ وابستہ لفظ "ترمذی" کو ہٹا دیا۔ ان کے سن شعور تک پہنچتے پہنچتے انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ ہند دہلی کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ میر بندے علی نے حالات سے سمجھوتا کرنا بہتر سمجھا اور تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ لیکن میر احمد علی نے 1857ء کی جنگ میں

انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا اور باغی کہلائے۔اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی۔کسی طرح بڑے بھائی (میر بندے علی) کی کوششوں سے چھوٹے بھائی (میر احمد علی) کی جان بخشی تو ہوئی لیکن ان کی ساڑھے پندرہ ہزار ایکڑ زمین بحق سرکار ضبط ہوگئی ساتھ ہی موروثی زمینداری بھی ضبط شدہ اراضی میں ضبط کر لی گئی۔جو اس وقت کے لکھنؤ، دلی اور سارے اتر پردیش کے ان گنت مسلم خاندانوں کے ساتھ ہوا۔اس ضبطی کی وجہ سے آنے والی نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں اختیار کرنا پڑا جو کہ وقت کا تقاضہ تھا۔

میر احمد علی کے چار بیٹے سید جلال الدین حیدر، سید کرار حیدر، سید غلام حیدر اور سید حسین حیدر تھے اور ایک بیٹی ام سعید تھیں۔غلام حیدر اور حسین حیدر نے طبابت کی تعلیم حاصل کی اور کرار حیدر یوپی میں سول سرجن کے عہدے پر فائز ہوئے۔ایک دفعہ ایک مریض کو دیکھنے جا رہے تھے کہ گھوڑے سے گر کر 35 سال کی عمر میں 1896 میں ان کا انتقال ہوگیا۔خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ان کی شخصیت کا احاطہ قرۃ العین حیدر اس طرح کرتی ہیں:

> ''سید جلال الدین حیدر ایک عجیب وغریب اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔اپنے جاگیرا دارانہ پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقتدار کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا تکبر یا رعونت نہ تھی۔ان کی پرشکوہ شخصیت، انصاف پسندی اور کٹر اصول پرستی کی وجہ سے لوگ ان سے

خائف رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان
کی شفقت، نیکی اور دردمندی کی وجہ سے عوام کو ان
سے بے اندازہ محبت بھی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں
بنارس میں انہیں مہاتما اور دیوتا سمان سمجھا جاتا تھا اور
ساٹھ ستر برس گذرنے کے باوجود بھی وہاں ان
کا نام ایک طرح کی تقدیس اور عقیدت کے ساتھ لیا
جاتا ہے۔" (۵)

سید جلال الدین کی شادی میر بندے علی اور اُن کی چوتھی بیوی سیدہ مریم خاتون کی بیٹی سعید بانو سے ہوئی۔ سعید بانو کی ننھیال میں ستر اولیاء گزرے ہیں۔ خود بی بی سیدہ ام مریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ سعید بانو بھی پردے کی بڑی پابند تھیں۔ ان کے زہد و تقوے کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان میں ریل شروع ہو چکی تھی لیکن انھوں نے بے پردگی کے خدشے کے سبب کبھی ٹرین کا سفر نہیں کیا۔ بلکہ وہ نہوڑ سے جھانسی جہاں ان کی ننھیال تھی بیل گاڑی سے سفر کرتی تھیں۔ سعید بانو کے بطن سے سید جلال الدین حیدر کو سید اعجاز حیدر، مغری فاطمہ، سجاد حیدر، نصیر الدین حیدر اور وحید حیدر پیدا ہوئے۔ میر بندے علی اور میر احمد علی کا انتقال 1880ء میں کچھ مہینے کے وقفے سے ہو گیا۔

یہ بچے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ سعید بانو کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد سید جلال الدین حیدر نے فرخ آباد کی ایک شعیہ خاتون سے عقد ثانی کر لیا لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سوتیلے بچے انہیں اماں یا "مائیدار" کہہ کر مخاطب

کرتے اور نہایت ادب و احترام سے پیش آتے تھے۔ جلال الدین حیدر نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ وہ اپنے بچوں کے دوست بھی تھے اور فلاسفر بھی۔ انھوں نے اپنے بچوں کی بہت اچھے انداز میں پرورش کی۔ جب یہ بچے بڑے ہوئے تو انہیں اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا اور ساتھ ہی ان کے دل میں اس بات کا بھی احساس بھر دیا کہ کسی کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ سجاد حیدر کے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ منجھلے بھائی سید نصیر الدین حیدر (1882-1946) پی۔ سی۔ ایس میں تھے اور بعد میں راجپوتانہ کی ریاست ٹونک میں وزیر بن گئے تھے۔ سب سے چھوٹے خان بہادر ڈ۔ کنز سید وحید الدین حیدر (1884-1947) یو پی میں سرول سرجن تھے اور لارڈ لنگڈن اور لارڈ کنکتھو کے اعزازی فزیشن تھے۔ یلدرم کی بہن صغری فاطمہ (1877-1933) اُن سے تین سال بڑی تھیں۔ انھوں نے بھی اپنے بھائیوں کے برابر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھیں۔ بہت اللہ والی اور متشرع خاتون تھیں۔ سانپ کا زہر اتارنے کا عمل جانتی تھیں اور نہوڑ میں حاجتمندوں کو تعویز اور نقش لکھ کر دیتی تھیں۔ سوائے پردے کے کسی پرانی رسم کی پابند نہیں تھیں۔

بچپن:

یلدرم نے بچپن بہت نارمل اور عام بچوں ہی کی طرح گزرا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے کھیلتے کودتے اور بے فکر و پر مسرت بچپن کا مزہ لیتے بڑے ہوئے تھے۔ کھیل کے دوران یلدرم اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا بہت

خیال رکھتے تھے۔ وہ بڑے بھولے بھالے بچے تھے۔ چونکہ عمروں میں بھی بہت کم فرق تھا اس لئے ان کی اور ان کی بہن صغریٰ فاطمہ کی بچپن میں بہت بنتی تھی۔ ایک دفعہ ایک نوکر نے ان سے کہا گملے میں پیسے بو دیجئے روپیوں کا درخت اُگ آئے گا۔ دونوں بہن بھائی نے اتفاق رائے سے جیب خرچ کے چند آنے جو وہ جوڑ جوڑ کر بنک میں جمع کرتے تھے وہ ساری جمع پونجی گملے میں دبا دی اور روز بڑے شوق سے اس کو پانی دینے لگے۔ دونوں بھائی بہن سے نظر بچا کر نوکر وہ پیسے نکال کر لے گیا۔ جب دولت کا درخت نہ اگا تو دونوں نے جا کر والد سے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ والد نے دونوں کو سمجھایا کہ کوئی دولت کا درخت نہیں اُگتا بلکہ محنت سے ہی کسی بھی چیز کو حاصل کیا جاتا ہے۔

تعلیم:

جلال الدین حیدر ملازمت کے سلسلے میں بنارس رہائش پذیر تھے جس کی وجہ سے سجاد حیدر کی ابتدائی تعلیم بنارس میں ہی ہوئی۔ 1894ء میں انھیں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں نویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے انھیں انگریزی اور فارسی پر کامل عبور حاصل تھا۔ فارسی میں مہارت کی وجہ سے وہ علامہ شبلی کے پسندیدہ شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن ریاضی میں کمزور تھے۔ جب ان کا ایف۔ اے کا رزلٹ آیا تو انھوں نے انگریزی اور فارسی میں تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی مگر ریاضی میں فیل ہو گئے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ ان کی قابلیت اور طبعی انکساری کی وجہ سے کالج میں ان

کی بہت قدر تھی۔ ریاضی میں فیل ہو جانے کے سبب ہر کوئی اس مضمون کو بد دعا دیتا تھا۔ باوجود ناکامی کے ان کی ہر دل عزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ طلبا، اور پروفیسروں کو ان سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہوگئی تھی۔ جوں توں کر کے ریاضی میں پاس ہوئے اور اس کے بعد 1901ء میں انھوں نے بی۔اے پاس کیا اور سارے صوبے میں سیکنڈ آئے۔ بی۔اے کرنے کے بعد سجاد حیدر ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگپور گئے مگر بعد میں گورنمنٹ نے انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دوبارہ علی گڑھ بھیج دیا۔ واپس آکر انھوں نے ایل۔ ایل۔بی میں داخلہ لیا جو علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا محض ایک بہانہ تھا۔ ابھی ان کی پڑھائی پوری نہ ہوئی تھی کہ بغداد کے قونصل خانے میں ایک ترجمان کی جگہ خالی ہوئی اور یلدرم اس کے لئے منتخب کر لئے گئے اور یوں ان کا ایل۔ایل۔بی ادھورا رہ گیا۔

دوران تعلیم دیگر دلچسپیاں:

یلدرم نہایت ہونہار طالب علم تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے پروفیسروں اور معاصرین میں بہت ممتاز تھے۔ وہ ''انجمن اخوان الصفا'' کے ممبر تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ یلدرم کو اسکول کے زمانے میں یونین میں تقریر کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اسکول کے سینئر بچے یونین کلب کے ممبر تھے اور یلدرم کو ان مباحثوں میں شرکت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی تب میر ولایت حسین نے ان کے لئے علیحدہ ڈیبیٹنگ سوسائٹی قائم کی جس کا جلسہ ہر اتوار کو اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہورسٹ کے کمرے میں منعقد ہوتا تھا۔ اس جلسے میں یلدرم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور تقریریں کرتے

تھے۔ بہترین تقریر کرنے پر یلدرم کو پہلا انعام اور کیمبرج پرائز بھی حاصل ہوا۔ بعد میں یلدرم کو یونین کے سب سے اعزازی عہدے بھی حاصل ہوئے یعنی پہلے وہ سیلیکٹ کیمٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین اور پھر سکریٹری۔

ایف۔اے۔ کے دوران یلدرم کے تعلقات نواب حاجی اسماعیل خان رئیس دتاؤلی (جو سرسید کے مخلص اور روشن خیال دوست تھے) سے ہو گئے اور سجاد حیدر ان کے سکریٹری بن گئے۔ یلدرم ان کو انگریزی پڑھاتے تھے اور خود ان سے ترکی سیکھتے تھے۔ نواب اسماعیل خاں نے علی گڑھ سے ایک رسالہ ''معارف'' نکالنا شروع کیا جس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سجاد حیدر بن گئے۔ کالج میگزین 1891ء میں جاری ہوا تھا لیکن بیگ صاحب کی وفات کے بعد پرنسپل موریسن نے میگزین پر بورڈنگ ہاؤس کے روپیوں کا قرض دیکھ کر اسے بند کرنے کا ارادہ کیا۔ بورڈنگ ہاؤس فنڈ سے اسے دوسو روپیہ سالانہ کی امداد ملتی تھی۔ سجاد حیدر اور اسسٹنٹ پروفیسر عبدالقادر نے ارادہ کیا کہ میر ولایت حسین کے تعاون سے اسے پرائیوٹ پرچے کے طور پر جاری کریں گے۔ پرنسپل موریسن، پروفیسر چنگ، ولایت حسین، عبدالقادر اور سجاد حیدر نے پرائیوٹ پرچے کے طور پر تین سو اولڈ بوائز اور کالج کے دیگر بہی خواہوں کے چار سو روپے سالانہ چندے کی رقم سے ''علی گڑھ منتھلی'' شائع کرنا شروع کیا جو بعد میں ''علی گڑھ میگزین'' کہلایا۔

ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لینے کے بعد یلدرم نے کوشش کر کے ریلوے کی کوٹھی جو کالج سے دور نہ تھی کرایے پر لے لی۔ اس میں دو کمرے قانون پڑھنے والے طلباء کے لیے مخصوص کر دیئے اور بقیہ ساری کوٹھی پر ان کا مشتاق احمد زاہدی اور انعام

الحق کا قبضہ ہو گیا جس کا نام انہوں نے ''بیچلرز لاج'' رکھا۔ اس کوٹھی میں یلدرم اور ان کے دونوں دوست کالج کے نئے پرانے ساتھی طلباء کو ہر ہفتے دعوت یا چائے پر مدعو کرتے یا اتفاقاً کوئی قوم کی مقدس ہستی کالج کے دورے پر ہوتی تو ان کے فیضان صحبت سے یہ لوگ استفادہ حاصل کرتے اور ایسے مباحث چھیڑتے تھے کہ جن پر باہمی تبادلہ خیال کے ذریعے اس بات کا حل تلاش کر سکیں جن کے ذریعے قومی اور معاشرتی مسائل کو حل کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں حقوق نسواں اور تعلیم نسواں وہ موضوع تھے جو اکثر زیر بحث ہوتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ جو ایک کشمیری نوجوان تھے اور یلدرم سے چند سال سینئر تھے انہوں نے علی گڑھ میں پہلی خواتین کانفرنس منعقد کی۔ اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین، سید امیر علی اور بدر الدین طیب جی اور نوجوانوں میں سجاد حیدر اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ کوئی بھی شخص تعلیم نسواں کا حامی نہ تھا۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں یلدرم اور ان کے ساتھیوں نے دل و جان سے کوشش کی اور اسے کامیاب بنایا۔

تعلیم نسواں کے علاوہ اس دور میں یلدرم پردہ، مغربی طرز معاشرت، احکام شریعت وغیرہ پر بھی بحث و مباحثوں میں معروف رہتے تھے۔ اس تعلق سے وہ کچھ ایسی تجاویز پیش کرتے جو اُس وقت ناقابل عمل تھیں اور آج بھی اسے قبول کرنے کوئی بھی تیار نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ یا مسجدوں میں ایسے غسل خانوں اہتمام کیا جائے جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں

کو وضو کرنے میں دقت نہ ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لیے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانون وراثت میں وہ مشترکہ خاندان کے طرز پر تبدیلی کرنا چاہتے تھے اُردو قرآن شریف، اردو نماز اور تقسیم وراثت پر ان کے مضامین اکثر رسالوں کی زینت بنے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے خلاف بہت لے دے بھی ہوئی۔

ایسا نہ تھا کہ یلدرم مذہب سے متنفر تھے۔ بلکہ وہ بہت سچے اور پکے مسلمان تھے مگر مذہبی تعصب پسندی اور تنگ نظری کے وہ قائل نہ تھے۔ وہ اس بات کو اخلاقی جرم سمجھتے تھے۔ مختلف مذاہب کے فلسفوں پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ پکے ہی نماز کے پابند نہ تھے لیکن جب بھی نماز پڑھتے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہتے ''آج ہم نے نماز پڑھی''۔ عبدالماجد دریابادی 'لسان الصدق' میں لکھتے ہیں

> ''اردو میں لکھتے اس وقت سے تھے جب ان سطور کے راقم کو (بہ محاورۂ عام) قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ اس نے ادب میں اچھا خاصہ استفادہ سید صاحب کی تحریروں سے کیا۔ ایک زمانہ میں مذہب سے بہت ہٹے ہوئے تھے۔ لیکن مہذب، شائستہ، نستعلیق اس وقت بھی رہے۔ بدزبانی، دل آزاری اس وقت بھی روا نہ رکھی۔ اب تو ماشاء اللہ خاصے مذہبی ہو گئے تھے۔'' (۲)

ملازمت:

یلدرم ابھی ایل۔ایل۔بی میں پڑھ ہی رہے تھے کہ برطانوی فارن آفس

سے کسی نے ان کے ایک انگریز پروفیسر کو لکھا کہ بغداد کے قونصل خانے کے لیے ایک ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت ہے۔ بہت سے طالب علموں نے درخواستیں دیں جن میں بعض ایسے حضرات بھی تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل صاحب کو سلام کرنا تھا۔ یہ حضرات عربی سے ایم۔اے کر چکے تھے۔ یلدرم نے بھی درخواست دی جو صرف بی۔اے تھے۔ حیرت انگیز طور پر یلدرم کا تقرر ہو گیا۔ کیونکہ پرنسپل موریسن نے سجاد حیدر کی تعریف بھی کی تھی اور حمایت بھی۔ 1904ء میں یلدرم بغداد چلے گئے۔ ان کے تقرر پر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق نے یلدرم کے جن نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا ملاحظہ فرمائیے:

> ''ہمارے کالج کے لائق اور ہر دلعزیز ن لعلم مسٹر سجاد حیدر بی اے ایک پولیٹیکل (پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سرحدی علاقوں، دیسی ریاستوں اور بیرونی برطانوی مقبوضات کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا) خدمت پر مامور ہو کر بغداد کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کا تعلق بالفعل بغداد میں برٹش کانسل سے رہے گا۔ ان کے اس تقرر سے خوشی بھی ہے اور افسوس بھی۔ وہ ایک معزز اور ذمے دار خدمت پر جا رہے ہیں۔ اور ان کی اعلیٰ لیاقت سے امید ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے نہایت مفید عہدیدار ثابت ہوں گے۔ اور کالج کا نام ہندوستان

سے باہر مشہور کرینگے۔ ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ ترکی
کی سلطنت میں جائیں اور وہاں کی زندگی اور پالی
ٹکس میں حصہ لیں۔ اسی شوق میں انہوں نے ترکی
زبان میں دستگاہ حاصل کی۔ ہمیں امید ہے کہ قدیم
اسلامی خانۂ تہذیب میں بیٹھ کر وہ ہمارے قومی
لٹریچر کو ضرور فائدہ پہنچائیں گے۔ اور وہاں گمشدہ
اسلامی روح اور شان کی تلاش اور تحقیق شروع
کرینگے۔" (7)

بغداد میں لگاتار تین سال انہوں نے اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دیئے۔ سیاسی کاموں میں اکثر لگائی بجھائی کرنا پڑتی ہے اور لوگوں کے گلے کاٹ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن یلدرم نے یہ کام نہ کیا جس کے نتیجے میں باوجود ایک اہم عہدے پر فائز ہوتے ہوئے انھیں کوئی خطاب نہ ملا اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بنا۔ بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ ہو گیا۔ 29 اکتوبر 1907ء میں سید جلال الدین حیدر کا ریاست ٹونک میں انتقال ہو گیا اور یلدرم چھٹی لے کر نومبر میں وطن لوٹے۔ اس کے بعد وہ بغداد نہیں گئے۔

جنوری 1908ء میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے ان کو دہرہ دون میں نظر بند سابق امیر کابل کا اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔ گرما کے موسم میں امیر یعقوب خان کا خاندان مسوری شفٹ ہو جاتا تھا۔ یہاں یلدرم شاہی قیدیوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تو کبھی قہوے کا دور چلتا تو کبھی شطرنج کی

بڑی چلتی۔ 1913ء میں مسئلہ کانپور کے بعد مسلم سیاسی تحریک زور پکڑ چکی تھی اور اسی دوران امیر یعقوب خان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے وفات کے بعد 1914ء میں مسلم لیگ لیڈر علی محمد خان راجہ محمود آباد نے گورنمنٹ سے یلدرم کی خدمات اپنے لئے حاصل کر لی اور انہیں اپنا پولیٹیکل سکریٹری مقرر کر لیا۔

یلدرم نے فرائض منصبی کے علاوہ بھی بہت ساری ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ مثلاً علی گڑھ کی بہت ساری ذمہ داریاں ان کے سر پر تھی اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے 1913ء میں ایم۔اے۔او کالج کے ٹرسٹی بھی مقرر ہوئے۔ راجہ صاحب مسلم لیگ کی سیاست میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ اس وقت ملک میں ہندو مسلم اتحاد قائم تھا اور مسلم لیگ کا جلسہ کانگریس کے جلسے کے ساتھ ہوتا تھا۔ انہیں دنوں راجہ صاحب کے ایک بے حد عزیز اور بے تکلف دوست بٹلر صاحب جو کہ یوپی کے گورنر تھے انھوں نے راجہ صاحب پر زور ڈالا اور ان کو سیاست سے الگ کر کے یوپی گورنمنٹ کا ہوم ممبر بنا دیا اور مہاراجہ کا خطاب دلوایا۔ 1918ء کے آخر میں سجاد حیدر نے یوپی سروس میں شامل ہو کر سلطان پور کے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ سنبھالا۔ 1920ء میں ایم۔اے۔او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو 17 دسمبر 1920ء کو نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے مہاراجہ سر علی محمد خاں محمود آباد کو چانسلر اور سید سجاد حیدر یلدرم کو بہ حیثیت رجسٹرار مقرر کیا۔ 1925ء میں رجسٹرارشپ کی پنج سالہ معیاد ختم ہونے کے بعد یلدرم کو دوبارہ رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں شعبۂ اردو قائم کیا اور اردو کا نصاب بھی منتخب کیا۔ رشید احمد صدیقی کو بطور لکچرر مقرر کیا اور خود شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعزازی صدر بنے۔ رشید

احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں مرحوم اس کے
رجسٹرار رہے۔ انھوں نے مہاراجہ محمود آباد، صاحب
زادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزل اللہ خاں،
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان
میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب
سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے
ساتھ کیا سازش کسی سے نہ کی۔ یہی ایک بات
یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم
دلیل ہے۔'' (۸)

اس وقت یونیورسٹی کے پرچے مدراس یا بمبئی میں چھپتے تھے۔ 1925ء میں یلدرم اور اسسٹنٹ رجسٹرار ابوالحسن اس سلسلے میں بمبئی گئے یہاں کار حادثہ پیش آیا کئی ہفتے سینٹ جارج اسپتال میں داخل رہنے کے بعد انھوں نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کی اور 1929ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار کی حیثیت سے خدمات انجام دی۔ جب ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف رحمت اللہ کمیٹی نے رپورٹ لکھی اور یونیورسٹی کے انتظام میں تبدیلی ہوئی تو سجاد حیدر واپس اپنے عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر لوٹ آئے۔ اس طرح یلدرم صدر شعبۂ اردو بہ حیثیت رجسٹرار 6 جون 1921ء سے 13 جنوری 1929ء تک علی گڑھ یونیورسٹی سے جڑے رہے۔ بعد میں حکومت نے ان کو واپس بلا لیا اور مارچ 1930ء میں یلدرم کا تبادلہ بہ حیثیت ریونیو کمشنر پورٹ

بلغیر جزائر انڈمان ہو گیا۔ یہاں کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد یلدرم نے واپس ہندوستان جانے کے لیے درخواست دی جو کہ منظور کر لی گئی اور وہ غازی پور، سلطان پور اور اٹاوہ ضلعوں میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر تعینات ہو گئے۔

جس وقت یلدرم اٹاوہ میں تھے اس وقت خالدہ ادیب خانم ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے علی گڑھ پہنچی۔ ان کے استقبال کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے ایک جلسے کا انعقاد کیا اور یلدرم کو بطور خاص خالدہ ادیب خانم کے تعارف کے لیے بلایا۔ سجاد حیدر، خالدہ ادیب کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے لہذا اس جلسے میں شامل ہوئے۔ یونین ہال میں سجاد حیدر نے خالدہ ادیب خانم کا خیر مقدم کیا اور موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاپردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ ذیابطیس کی وجہ سے یلدرم کی صحت مسلسل گرتی جا رہی تھی جس کی بناء پر انھوں نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ دہرہ دون چلے گئے۔ جہاں انھوں نے اپنی کوٹھی ''آشیانہ'' لے رکھی تھی۔ دہرہ دون میں ایک ڈاکٹر محمد حسین آ کر بس گئے تھے جو برسوں سعودی عرب میں مقیم تھے۔ یہاں انھوں نے ایک اسکول ''دہرہ کیمبرج اسکول'' قائم کیا اور یلدرم کو اس کے آنریری سکریٹری شپ کی ذمہ داری دی۔ کچھ عرصہ بعد مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے یہ اسکول بند ہو گیا۔ اس سال دہرہ دون میں بہت تیز بارش ہوئی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے یلدرم کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اور انھیں ملیریا، انفلوئنزا اور ڈبل نمونیہ نے آن گھیرا۔ ابھی صحت کچھ سنبھلی ہی تھی کہ امیر احمد خاں جو اس وقت کے راجہ صاحب محمود آباد تھے اور یلدرم کو 'چچا' کہتے تھے دہرہ دون تشریف لائے اور یلدرم کو زبردستی اپنا پولیٹیکل سکریٹری مقرر

کر کے اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔ اس ملازمت سے یلدرم زندگی کے آخری لمحے تک جڑے رہے۔

یلدرم کبھی خالی بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی اور دوران ملازمت انھوں نے بہت ساری ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی تھی۔ وہ علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے بہت سرگرم سیکریٹری اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔ ہندوستان اکیڈمی الہ آباد کے ممبر اور صدر بھی تھے۔ ساتھ ہی کئی یونیورسٹیوں کے ممتحن بھی تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ باوجود کمزوریٔ صحت وہ ہر وقت کسی نہ کسی کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے اور ہر نئی ذمہ داری کو خندہ پیشانی سے ساتھ قبول کر لیتے۔

شادی:

پڑھائی کے سلسلے میں یلدرم جب علی گڑھ میں قیام پذیر تھے اور تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے اس وقت ان کی اور ان کے ساتھیوں کی اپنی ہونے والی ہمسفر سے متعلق جو خیالات تھے ملاحظہ فرمایئے:

> ''اس وقت ہمارا یہ خیال بہت زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔ اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کوئی تہذیب بہت چڑھ گئی تھی۔ اور اس زمانے میں یعنی اب سے پچاس برس قبل مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے تو محض نابلد تھیں،

اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا۔ اور جن کو آتا تھا
وہ اس زمانے میں بڑی تعلیم یافتہ سمجھی جاتی تھیں اور
مغربی طرز زندگی سے تو سارے ہندوستان میں
سوائے معدودے چند خواتین کے کسی کو بھی واسطہ نہ
تھا۔ اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہم بیچلرز
لاج میں صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اس کی ہماری
رفیقۂ حیات بھی اہل ہو اور چونکہ یہ بات ناممکن
معلوم ہوتی تھی اس لیے یہ خیال دل نشین ہو گیا تھا
کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی
نہ چاہیے۔ ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے
اور ہم نے اس وقت سے اپنا مقصد زندگی مسلمان
ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراجِ ترقی
تک پہنچانا قائم کیا تھا۔'' (۹)

یلدرم کے قیام بغداد سے واپسی پر ترکی سے لگاؤ کے سبب دوست احباب یہ سمجھتے کے وہ کسی ترک لیڈی سے ہی شادی کریں گے۔ لیکن جب وہ بغداد سے ہندوستان تنہا لوٹے تو دوستوں میں خوب کھلبلی مچ گئی کہ شاید اگلے جہاز سے ان کی بیوی اترے گی لیکن انھوں نے اپنے دوستوں پر واضح کر دیا کہ بھلے ہی انہیں ترکی سے محبت ہے لیکن وہ شادی ہندوستان میں ہی کریں گے۔ یلدرم کی مرضی کے مطابق ان کی شادی ایسی ہی ایک لڑکی ''نذر زہرا بیگم'' سے ہوئی جو شمس العلماء مولوی سید ممتاز

علی کے ہفتہ وار اخبار ''تہذیب نسواں'' میں مضامین لکھتی تھیں اور شعیہ مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اُس زمانے میں عورت کا نام بھی پردے میں رکھا جاتا تھا تو وہ ''مسز نذر الباقر'' یا ''بنت نذر الباقر'' کے نام سے لکھتی تھیں۔ ان کی پھوپھی اکبری بیگم بھی ''والدہ افضل علی'' کے نام سے ناول لکھتی تھیں۔

بنت نذر الباقر ''تہذیب نسواں'' کے علاوہ ''پھول'' اور دیگر رسائل میں بھی اپنے مضامین لکھتیں تھی اور انہوں نے 1908ء میں ''پھول'' کی ادارت بھی کی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے بچوں کے لیے باتصویر کتابیں ''سلیم کی کہانی''، ''پھولوں کا ہار''، ''دکھ بھری کہانی''، ''بچی رضیہ اور اس کی بکری'' وغیرہ لکھیں جو پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی کی جانب سے اسکولوں کے اردو نصاب میں شامل کی گئیں۔ نذر زہرا بیگم نے 1910ء میں دو ناول ''اختر النساء بیگم'' اور ''آہ مظلوماں'' اس وقت لکھیں جب ان کی عمر محض 16 سال کی تھی۔ نذر زہرا بیگم کے والد کا نام نذر الباقر اور والدہ کا نام مصطفائی بیگم تھا۔ ان کی پیدائش 1894ء میں صوبہ سرحد میں ہوئی تھی۔ ان کے دادا خان بہادر میر قائم علی کو پنجاب کے قانون اراضی کے تشکیل و تنظیم کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور نذر الباقر فوج کی سپلائی میں بطور ایجنٹ صوبہ سرحد میں مامور کیے گئے تھے۔ نذر الباقر کے اسلاف ملکہ نور جہاں کے عہد میں نیشا پور (ایران) سے دربار جہانگیر میں مدعو کیے گئے تھے۔ نیشا پور سے آ کر یہ لوگ مراد آباد میں بس گئے تھے اور انہیں باون گاؤں مع نوابی خطاب کے دیے گئے تھے۔ دربار کے علمی کام انہیں لوگوں کے سپرد تھے خاص طور پر حکومت کا نظم و نسق اور محکمہ مالیات کے عہدے انہیں کے زیر نگرانی تھے۔ نذر الباقر نے اپنی دونوں بیٹیوں نذر زہرا بیگم اور ثروت آراء بیگم کو پردے میں

ہی گورنس سے تعلیم دلوائی تھی اور جدید مغربی طرز معاشرت سے اپنی اولاد کو سرفراز کیا تھا۔

نذر زہرا بیگم کے لیے یلدرم نے مولوی سید ممتاز علی کے ذریعے رشتہ بھیجا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ وہ شادی کے بعد ان کا پردہ ختم کرا دیں گے۔ یلدرم کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑھتا تھا کہ وہ شیعہ مسلک سے ہیں بلکہ وہ اس بات کو اہمیت دیتے تھے کہ شادی کے لیے لڑکا اور لڑکی کے خیالات آپس میں کتنے میل کھاتے ہیں اپنے ایک خط میں مولوی سید ممتاز علی کو لکھتے ہیں

"گو میں سنی ہوں مگر ہمارے خاندان میں شیعہ سنیوں میں آپس میں رشتے ہوتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میرے بہت سے عزیز شیعہ ہیں رہا خود میں سو میں اپنے ذاتی خیالات میں نہ سنی ہو نہ شیعہ۔ کیوں کہ خلافت کے معاملے کو محض ایک Academic Interest کی چیز سمجھتا ہوں۔ مذہب کے بارے میں یا ہمارے آج کل کے مخالفین کی اصطلاح میں یونہی سمجھ لیجیے کہ پکا نیچری ہوں۔ آگے چل کر قبر پرست یا پیر پرست بن جاؤں تو خبر نہیں۔

اوپر کے جملوں کو پڑھ کر خود مجھے ہنسی آتی ہے۔ معاملہ تو شادی کا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دیکھا

جائے کہ میری طبیعت مس باقر کی طبیعت سے میل
کھا سکے گی یا نہیں اور بجائے اس کے کہ یہ تحقیقات
کی جائے کہ مس باقر مجھ سے نفرت تو نہیں کرتیں
(الفت کا نام ہی لینا فضول ہے) بحث یہ کی جاتی
ہے کہ تم حضرت علیؑ کو خلیفہ بلا فصل مانتے ہو یا
نہیں۔"۔(۱۰)

یلدرم نے اپنی ایک فوٹو بغداد میں کھنچوائی تھی جو رسالہ "مخزن" (لاہور) میں 1907ء میں شائع ہوئی تھی۔ جب رشتہ کی بات چل رہی تھی تب ان کی یہ فوٹو نذر الباقر نے اپنی ساس کو دکھائی جو پہلے ایک سنی لڑکے سے رشتہ طے کرنے تیار نہیں تھی۔ اس بیچ یہ افواہ پھیل گئی کہ بنت نذر الباقر کی آنکھیں کمزور ہوگئی کہ اب وہ تقریباً نابینا ہوگئی ہیں۔ اس بات کی اطلاع جب یلدرم کو ہوئی تو انھوں نے فوٹو کی فرمائش کردی۔ افواہ اور فوٹو کی فرمائش سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور یلدرم پیچھے ہٹ گئے لیکن مولوی ممتاز علی نے معاملہ سلجھا لیا۔ یلدرم نے فوٹو کی ضد چھوڑی اور ترکی برقعہ بھی پہنانے پر راضی ہوگئے۔ جو وہ ترکی سے اپنے ساتھ لائے تھے اور اپنے دوست مشتاق زاہدی کے پاس رکھا تھا۔ اس برقعہ میں منہ کھلا رہتا تھا اور وقت ضرورت کالی جارجٹ کی نقاب چہرے پر ڈال لی جاتی تھی۔ شادی کے سارے معاملات طے پانے کے بعد یلدرم اپنے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر، بہنوئی سید برہان الدین حیدر، شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی اور ان کے بیٹے امتیاز علی تاج کو ساتھ لئے نکاح کے لئے کوہاٹ پہنچے جہاں نذر الباقر رہائش پذیر تھے۔ مولوی سید محسن علی لاہوری نے خطبہ نکاح پڑھا

اور سجاد حیدر جون 1912ء میں نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔

پوری تقریب شرعی سادگی اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ ہوئی نہ کوئی گانا بجانا نہ آتش بازی اور نہ کوئی بے ہودہ رسم۔ نذر زہرا بیگم کی نانی اشرف جہاں بیگم نے دولہا کو "آفتاب میاں" کے لقب سے نوازا اور بعد نماز مغرب نذر الباقر نے جلسہ ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس ضیافت میں نذر الباقر کے دوست، احباب اور رشتہ داروں نے لاہور، گجرات، راولپنڈی، نوشہرہ اور پشاور سے آکر شرکت کی۔ نذر الباقر کے گھر کے لان پر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ کوہاٹ کے لوگ یلدرم کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ مدعو کئے گئے لوگوں کے علاوہ بن بلائے مہمان بھی بہت جمع ہو گئے تھے۔ جس وقت طعام شروع ہوا وہ لوگ خاموشی سے باغیچے میں ٹہلتے رہے۔ میزبان مہمانوں کی تواضع میں لگے ہوئے تھے اور اس مجمع پر کسی کی نظر نہ پڑی جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آکر بیٹھنے لگے تب دیکھا تو ساٹھ ستر افراد جمع تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے جو یلدرم کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھتے تھے اور بیرسٹر تھے آگے بڑھ کر یلدرم سے کہا "زہے نصیب! کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے جس طرح آپ کو زیارت قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی ہم کو زیارت یلدرم کی کشش بنوں اور ہنگو سے کوہاٹ لے آئی۔

ان سب لوگوں نے آگے بڑھ کر یلدرم کو اپنے حلقے میں لے لیا اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور لوگوں کو یلدرم کا چہرہ برابر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ بیرسٹر صاحب نے قریب سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر چہرے کے برابر کر دی اور با آواز بلند کہا "اے مشتاقان دیدار یلدرم۔ دیکھیئے دل انگش رخ ترکانہ داری۔" ایک ایک

کر کے سب حضرات آتے گئے اور یلدرم سے ملاقات کرتے گئے۔ اس وقت یلدرم بادامی رنگ کے جاپانا سلک سوٹ میں ملبوس بنا سہرا باندھے کھڑے تھے اور دلہن نے سفید چینا سلک کا غرارہ، جاکٹ اور گلابی ڈوپٹہ پہن رکھا تھا۔ یلدرم کی ان سب لوگوں سے ملاقات کے بعد نذر الباقر نے اُن تمام لوگوں کے بھی طعام کا اہتمام کیا۔ شادی کے بعد نذر زہرا بیگم، نذر سجاد حیدر کہلائیں۔ کچھ عرصہ بعد انھوں پردہ ترک کر دیا اور سیاسی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نذر سجاد حیدر نے رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' میں ''ایام گذشتہ'' کے عنوان کے تحت روز نامچہ لکھے اور ناولیں بھی لکھے جن میں ''ثریا''،''جاں باز'' اور ''حرماں نصیب'' شامل ہیں۔ 19 اکتوبر 1967ء میں بمبئی میں طویل علالت کے باعث ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اور سید سجاد حیدر یلدرم نے ایک کامیاب زندگی گزاری جس کے متعلق سید رضا علی لکھتے ہیں:

> ''سجاد حیدر رسوم و قیود کے پابند نہ تھے بلکہ وہ ایسے رسم و رواج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس سے سوسائٹی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ شادی کے معاملے مین انھوں نے بڑی ہمت مرادنہ سے کام لیا اور ایک اعلی درجہ کی تعیلم یافتہ خاتون سے جو ایک شیعہ خاندان مین پیدا ہوئین اور خود بھی شعیہ تین شادی کی۔ بنت نذر الباقر صاحبہ (بیگم سجاد حیدر) مراد آباد کے ایک معزز سید خاندان کی بیٹی ہین۔ ان

کے والد نے ان کو بہت اچھی تعلیم دلائی اور آج سے
تیس برس پہلے وہ نسوانی اصلاحی تحریک کی صف اول
کی ممتاز کام کرنے والیوں میں تھیں۔ رواداری
عجیب نعمت ہے۔ سجاد حیدر سُنّی تھے اور بی بی شیعہ مگر
دونوں نہایت خوش و خرم اور فرقہ وارانہ اختلاف کی
پراگندگی سے محفوظ و مامون رہے۔" (۱۱)

اولادیں:

سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کو چھ اولادیں پیدا ہوئیں۔ فلک اختر (5 جون 1913ء)، سید جواد حیدر (14 جولائی 1914ء)، شہزاد، گل رعنا (1915ء)، سید مصطفےٰ حیدر (1920ء سلطان پور) اور سب سے چھوٹی قرۃ العین حیدر (20 جنوری 1927ء۔ 21 اگست 2007ء)۔ یلدرم کے چار بچے صغر سنی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ فلک اختر اور شہزاد کا ہیضہ کی وجہ سے انتقال ہوا۔ گل رعنا کا انتقال پولیوں کی وجہ سے ہوا۔ سید جواد حیدر کو قیام سلطان پور میں ایک رات آیا نے نیند کی غنودگی میں دودھ کی بوتل کے بجائے دودھ کی بوتل صاف کرنے والی اسپرٹ منہ میں لگا دی اور بچہ انتقال کر گیا۔

یلدرم نے اور نذر سجاد حیدر نے سید مصطفےٰ حیدر اور قرۃ العین حیدر کی تربیت میں کوئی کمی نہیں کی۔ سید مصطفےٰ حیدر نے ریاضی سے ایم۔اے کیا اور مسلم لیگ کے رکن بن گئے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس

کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ سید مصطفیٰ حیدر کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ ان کی شادی اورنگ آباد دکن کے ایک وکیل کی بیٹی عاصمہ بیگم سے ہوئی۔ جن کے والدین کا ان کے بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا اور وہ لکھنؤ میں مقیم اپنے خالو چودھری نعمت اللہ کے یہاں رہتی تھیں۔ مصطفیٰ حیدر کے بچوں کے نام نورالعین، شہناز، ناہید، جلال حیدر، عدنان حیدر، منصور حیدر اور سجاد حیدر ہیں جو پاکستان اور دیگر مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے انٹرمیڈیٹ 1941ء میں ازابل تھوبرن کالج لکھنؤ سے، بی۔اے 1945ء میں آئی۔پی کالج دہلی یونیورسٹی، ایم۔اے 1947 لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک نامور مصنفہ ہیں۔ ان کے 5 افسانوی مجموعے، 9 ناول، 4 ناولٹ، 2 رپورتاژ کے مجموعے، ایک خاکے کی کتاب، 8 تراجم، بچوں کے لیے متعدد کتابیں اور 15 ایڈٹ شدہ کتابیں ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے عوض حکومت ہند نے انھیں 28 مارچ 2005ء میں پدم بھوشن سے نوازا تھا۔ اپنے بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت ہی دوستانہ تھا۔ وہ ان کی ہر بات کو بڑے غور سے سنتے ان کے ہر اہم اور غیر اہم سوالوں کا جواب نہایت پیار سے دیتے تھے۔ انھوں نے کبھی لڑکا اور لڑکی میں فرق نہیں کیا۔ ایک واقعہ کا ذکر قرۃ العین حیدر یوں کرتی ہیں:

"ابا جان وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے۔
ایک روز میں پھاٹک سے لے کر موٹر خانے تک کی
طویل سڑک پر سائیکل چلا رہی تھی۔ برساتی میں نکل

آئے۔ دو منٹ بعد اپنے کمرے میں گئے پھر ہاتھ
میں ایک مکھن زین کی سفید پتلون لئے باہر آئے
۔ جب میں سائیکل پر سوار برساتی میں سے گزری
کہنے لگے "سائیکل آپ کو ہمیشہ پتلون پہن کر چلانی
چاہیے یہ لیجئے۔ اسے درزی سے اپنے لئے ٹھیک
کروا لیجئے۔" (۱۲)

انھوں نے اپنی بیٹی کو ہمیشہ جدید طرز کی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ان کی بڑی خواہش تھی کہ قرۃ العین حیدر لندن سے اعلی تعلیم حاصل کرے اگر زندگی انھیں کچھ وقت کی مزید مہلت دیتی تو وہ قرۃ العین حیدر کو بقیہ ساری تعلیم لندن سے ہی دلاتے۔

ادبی زندگی کی شروعات:

یلدرم کی مضمون نگاری کی ابتداء ایف۔ اے کے دوران یا اس سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اُس وقت وہ قوم کی اصلاح کے لیے جن موضوعات کو بہتر سمجھتے ان کی حمایت بہ ذریعہ تحریر اور تقریر کرتے تھے۔ ساتھ ہی رسالہ "معارف" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے اپنے اکثر مضامین اسی میں شائع کرواتے تھے۔ انگریزی رسالوں میں جو مضامین معیاری ہوتے تھے ان کا اردو ترجمہ بھی وہ شائع کرتے۔ انگریزی انشاء پردازی میں بھی یلدرم کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں یلدرم کے طبیعت میں بلا کی شوخی تھی جس کی یادگار ان کی نظم "مرزا پھویا علی گڑھ میں" 1900ء ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

اُس وقت کالج کے طلباء میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کا مضمون رسالہ "پانیر" میں چھپ جائے۔ بہت سارے طلباء اس وقت ایسے تھے جنھیں اپنی انگریزی پر بڑا ناز تھا اور کبھی اپنے مضامین "پانیر" کو بھیجتے تھے۔ لیکن سجاد حیدر وہ پہلے شخص تھے جن کا مضمون سب سے پہلے "پانیر" میں شائع ہوا تھا۔ "پانیر" کے علاوہ یلدرم کے مضامین اُردوئے معلّیٰ، مخزن (دورِ اوّل)، زمانہ، علی گڑھ میگزین، ہمایوں، تہذیب اور نیرنگ خیال میں چھپتے تھے۔

تصانیف:

یوں تو سجاد حیدر کی تصنیف و تالیف کا کام طالب علمی کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کے بہترین انشاء پرداز تھے ان شخصیت ہمہ جہت تھی۔ نثر نگاری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کے علاوہ انھوں نے شاعری بھی کی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں جدت دکھائی، رپورتاژ نگاری کے موجد ہونے کا سہرا بھی انہیں کے سر جاتا ہے۔ اگر یلدرم کو فرصت کے لمحات میسر آتے تو وہ اپنے قلم کے زور سے اردو ادب میں کچھ اور اہم اضافے ضرور کرتے۔ لیکن ملازمت کی مجبوری کے تحت وہ کل وقتی ادیب نہ بن سکے۔ آزادی سے قبل کسی بھی ہندوستانی کو یہ آزادی نہیں تھی کہ وہ عربی، فارسی، سنسکرت، یا ریاضی کے علاوہ اور کوئی مضمون پڑھا سکے۔ ریاضی پڑھانے کی اجازت بھی اس لیے دی گئی تھی کہ بنگال کے پی۔ گھوش نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ایک ہندوستانی بھی بہترین ریاضی داں ہو سکتا ہے۔ اگر اس وقت کی علی گڑھ کالج کی انتظامیہ کمیٹی چاہتی تو سجاد حیدر کو انگریزی یا فارسی کا لیکچرر مقرر کر

سکتی تھی اور وہ ادب کے لیے بہت کچھ کر پاتے۔ اس سلسلے میں ان کے دوستوں کے یہ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے :

''ہمارا صوبہ تعلیم کے معاملہ مین اس قدر رجعت پسندی تھا کہ انگریزی ادب کے علاوہ بھی اکثر مضامین کے پروفیسر انگریز ہوتے تھے۔ میری ناچیز رائے مین اگر سجاد حیدر مرحوم بی۔اے پاس کرنے کے بعد علی گڑھ کالج مین انگریزی زبان کے جونیر لیکچرر مقرر کردیئے جاتے تو انگریزی ادب کی دنیا مین کافی شہرت حاصل کرنے کا موقعہ ان کو مل جاتا اردو غریب اس زمانے مین اس قابل نہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی یونیورسٹی یا کالج کے احاطہ مین اسے بازیابی کا شرف حاصل ہوسکے۔ سجاد مرحوم کے سپرد اگر فارسی پڑھانے کی خدمت کردی جاتی تو لکیر کے فقیر ہونے کے بجائے ان کی جدت پسند طبیعت بیسوین صدی عیسوی کے ایرانی چمن کے گل بوٹے اہل وطن کے سامنے اس خوبی سے پیش کرسکتے کہ فارسی زبان و ادب کے خوش نما تختے ہمارے نوجوانوں کے دلون مین نئی امنگین پیدا کرتے۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ سرکاری ملازمت کے قیود و شرائط کے

باعث مرحوم کی طبیعت کے جوہر پورے طور پر نہ
کھلنے پائے۔ بھلا غور کیجئے جب سجاد جیسے آزاد منش
اور شگفتہ مزاج آدمی کو چھ سات گھنٹے روزانہ کچہری
میں بیٹھ کر مال کے مقدمات میں کھتونی اور خسرہ کے
اندراجات کو پٹواری کے اس بیان سے مطابق کرنا
پڑے جو اندراجات مذکورہ کے بالکل متضاد ہو اور
جب بہ حیثیت مجسٹریٹ ضرب شدید کے مقدمے
میں ملزم کے ایک درجن معزز گواہان صفائی کی
شہادت قلم بند کرنا پڑے کہ جس وقت مارپیٹ کا ہونا
بیان کیا جاتا ہے ٹھیک اس وقت ملزم کسی شادی میں
شریک یا دعوت میں موجود تھا تو طبیعت کی شگفتگی
کیا خاک قائم رہ سکتی ہے۔ سجاد حیدر نے بہت
تجربے حاصل کئے۔ بہت ممکن ہے کہ مہتمم خزانہ
کے وہ فرائض بھی انجام دیئے ہوں جو دو برس کے
عرصہ میں آدمی کو انسان سے مشین بنا ڈالتے
ہیں۔ جب زندگی میں اتنے مرحلے پیش آئیں اور
دنیا کے جھگڑے چین نہ لینے دیں تو بڑے سے
بڑے پرسوز آدمی کی طبیعت بھی مرجھا جائے گی۔"

(۱۳)

''علیگڑھ کے دار العلوم نے جہاں اُن کی نوجوانی کا بہترین زمانہ گزرا اُن کی قدر کی ہوتی اور اُن کو ایک علمی اور ادبی فضا میں سکون قلب حاصل کرنے کا موقعہ دیا ہوتا تو خدا جانے وہ کتنے بے مثل ادبی شاہکار لکھتے جن سے ہماری روحوں کے آتش خانے گرم ہوتے لیکن ہرن کی پیٹھ پر گھانس لادی گئی اور سجاد کو دنیا نے ادب کی محفل کے بجائے ''ڈپٹی کلکٹری'' کی کچہری میں دیکھا! شعر و ادب کے اُن چند لمحوں کو جنھوں نے اُن کی زندگی میں راہ پائی وہ عمر بھر ایک جنازے کی طرح کاندھے پر لئے پھرے ------ لوگ اُس جنازے کے دوشالہ کی زر کاری کو دیکھتے گئے۔ یہ نہ دیکھا کہ اُس دوشالہ کے نیچے کوئی بہت پرانا ناسور ہے! سجاد حیدر کی ادبی زندگی کا خون اُن لوگوں کی گردن پر ہے جنھوں نے اس بہتے ہوئے چشمہ کا رُخ باغ کی کیاریوں سے پھیر کر مینڈکوں کے اس تالاب کی طرف بدل دیا جہاں ایک چلو پانی پورا سمندر سمجھا جاتا ہے! اس طرح سجاد مرنے سے پہلے مر چکے تھے---مارے جا چکے تھے!'' (۱۴)

یلدرم کا پہلا افسانہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" معارف میں اگست 1900ء میں شائع ہوا تھا جسے بعد میں انشائیہ قرار دیا گیا۔ اس کے بعد "نشہ کی پہلی ترنگ" معارف میں اکتوبر 1900ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے اکثر اردو کا پہلا افسانہ کہا گیا ہے جو ترکی افسانے کا ترجمہ تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "خیالستان" 1910ء میں مخزن بک ڈپو لاہور سے منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل بھی افسانے اور انشائیے مجموعے میں چھپنے سے قبل ہی اس وقت کے نامور ادبی رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ یلدرم نے کئی ناول، ناولٹ اور ڈراموں کے تراجم کیے۔ ان کی تحقیقات کی فہرست جس میں کلام یلدرم شامل نہیں ہے کو پروفیسر ثریا حسین نے اس طرح ترتیب دیا ہے

ا۔ ناول نویسی (مقالہ) معارف اکتوبر 1899ء

۲۔ مسئلہ ازدواج پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات از سجاد حیدر آنریری ایس۔ یو کلب معارف یکم مئی 1899ء

۳۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ معارف اگست 1900ء

۴۔ انگریزی لٹریچر اور ہندوستانی مسلمان معارف ستمبر 1900ء

۵۔ نشے کی پہلی ترنگ (افسانہ از مفخرہ) معارف اکتوبر 1900ء

۶۔ مرقع سرکیشیا (ناول از احمد مدحت) معارف ستمبر تا جنوری 1901ء

۷۔ جواب (افسانہ از خلیل رشیدی) معارف جولائی 1901ء

۸۔ فطرت جواں مردی (افسانہ از مفخرہ) مخزن جولائی 1901ء

۹۔ مولانا حالی کی شاعری پر مولوی محبوب الرحمٰن کی تنقید اردوئے معلی 1901ء

۱۰۔ایک دوست کی خبر وفات سن کر 1901ء

۱۱۔ثالث بالخیر (ناولٹ از احمد حکمت)

۱۲۔زہرا (ناولٹ از ناظم بی زادہ) مطبوعہ کالج بک ڈپو علی گڑھ 1902ء

۱۳۔مطلوب حسیناں

۱۴۔ایک نیا ستارہ۔۔۔اقبالؔ 1903ء

۱۵۔تعلیم نسواں بذریعہ ازدواج علی گڑھ منتھلی نومبر 1903ء

۱۶۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ منتھلی جنوری 1904ء

۱۷۔سفر بغداد 1904ء

۱۸۔انسان و انسانیت مخزن اپریل 1905ء

۱۹۔جہاں پھول کھلتے ہیں (طبعزاد) علی گڑھ منتھلی ستمبر 1905ء

۲۰۔صحبت ناجنس (تحریر) 1905ء

(مطبوعہ) مخزن فروری 1906ء

۲۱۔ایک مغنّیہ سے التجا اردوئے معلی فروری 1906ء

۲۲۔میں چاہتا ہوں (طبعزاد) اردوئے معلی مارچ/اپریل 1906ء

۲۳۔احمد۔۔۔۔۔علی گڑھ کا ایک قصہ اردوئے معلی مئی 1906ء

۲۴۔خارستان و گلستان (ماخوذ از احمد حکمت) مخزن جون 1906ء

۲۵۔خارستان (ماخوذ از احمد حکمت) مخزن جون 1906ء

۲۶۔شیرازہ (ماخوذ از احمد حکمت) مخزن ستمبر 1906ء

۲۷۔غربت و وطن (طبعزاد) اردوئے معلی جنوری 1907ء

۲۸۔ میرے دوست نے والے (طبعزاد) اردوئے معلی جنوری 1907ء

۲۹۔ حضرت دل کی سوانح عمری (طبعزاد) تحریر 16/ دسمبر 1906ء

(مطبوعہ) مخزن فروری 1907ء

۳۰۔ چڑیا چڑے کی کہانی (طبعزاد) مخزن اپریل 1907ء

۳۱۔ ازدواج محبت (طبعزاد)

۳۲۔ نکاح ثانی (طبعزاد) مخزن جون 1907ء

۳۳۔ سیل زمانہ (طبعزاد) مخزن جون 1907ء

۳۴۔ اگر میں صحرا نشین ہوتا (طبعزاد) مخزن دسمبر 1907ء

۳۵۔ حکایہ لیلے و مجنوں (طبعزاد) مخزن اکتوبر 1907ء

مخزن اپریل 1908ء

مخزن مئی 1908ء

۳۶۔ سودائے سنگین (ماخوذ) مخزن اگست 1908ء

۳۷۔ خیالستان (مجموعہ) مخزن بک ڈپو لاہور 1910ء

۳۸۔ زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ تمدن۔ دہلی جنوری 1911ء

۳۹۔ اللہ بوائے تانپ میں اودھ بوائے۔ بنارس جولائی 1911ء

۴۰۔ سر سید کی قبر پہ اللہ بوائے بنارس مئی 1912ء

۴۱۔ آشیان مستقبل (طبعزاد) نقاد۔ آگرہ جنوری 1914ء

۴۲۔ میرے بعد (طبعزاد) تمدن لکھنؤ اکتوبر 1915ء

۴۳۔ جلال الدین خوارزم شاہ (ڈرامہ نامکمل ہے) کہکشاں۔ لاہور ستمبر

1918ء تا مارچ 1920ء، علی گڑھ میگزین 1922ء

۴۴۔ ایک دن ہوتا ہے   کہکشاں لاہور مارچ 1919ء

۴۵۔ بس ایک نظر   زمانہ   جولائی 1919ء

۴۶۔ ز۔ خ۔ ش   ہمایوں لاہور   1921ء

۴۷۔ ''ترقی اردو'' (خطبۂ صدارت سالانہ جلسہ انجمن ترقی اردو منعقدہ سینٹ جانز کالج، آگرہ ۲۲ فروری 1921ء

۴۸۔ مجلّہ پارس   علی گڑھ میگزین   جولائی تا اکتوبر   1921ء

۴۹۔ گمنام خطوط   ہمایوں لاہور   1923ء

۵۰۔ قوت (طبعزاد) ہمایوں لاہور   1923ء

۵۱۔ ہجوم تنہائی (طبعزاد) ہمایوں لاہور   مئی 1923ء

۵۲۔ حکایات، احساسات (مجموعہ) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ   1927ء

حکایات (مصنف کے نوٹ کے مطابق ترکی سے بہ تصرف تراجم)

افسانہ ہائے عشق، گمنام خطوط، بزم رفتگاں، کوسم سلطان، مادر وطن، ویران صنم خانے، آئینے کے سامنے، تیتری، ایک مغنیہ سے التجا۔ عورت کا انتقام، والہانہ انتخاب۔

احساسات (طبعزاد) جہاں پھول کھلتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ، آہ! یہ نظریں، کلیو پیٹرا، سید کی قبر پہ، میرے بعد وغیرہ۔

۵۳۔ آسیب الفت   سالنامہ نیرنگ خیال   1929ء

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ   1930ء

مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1940ء

۵۴۔جذباتِ یلدرم زمانہ (کانپور) ستمبر 1930ء

۵۵۔پرانا خواب (ترکی ڈرامہ) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ 1930ء

۵۶۔ہما خانم (فارسی ناول از محمد حجازی) نیرنگ خیال 1931ء

ادارہ ادب اردو حیدر آباد دکن 1932ء

نفیس اکیڈمی کراچی (غیر قانونی ایڈیشن)

۵۷۔سفرِ حجاز نیرنگ خیال اپریل 1934ء

۵۸۔جنگ و جدال (ترکی ڈرامہ) مسلم یونیورسٹی پریس 1932ء

۵۹۔خطبۂ صدارت معہ تتمہ۔اجلاس ششم۔شعبہ اردو ہندوستان اکیڈمی۔الہ باد

مارچ 1938ء

۶۰۔ایک کہانی پانچ ادیبوں کی زبانی (باشتراک علی عباس حسینی۔ل۔احمد۔امتیاز علی تاج حکیم احمد شجاع بفرمائش آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ) مطبوعہ کتب خانہ علم و ادب۔دہلی

1938ء

۶۱۔طغرل و سنجر (از شرف الدین بک) سہیل

۶۲۔طارق (ترکی ڈرامہ از عبدالحق حامد) نامکمل۔نگار۔لکھنؤ۔اپریل 1943ء ادبی موضوعات پر مختلف تقاریر۔آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہوئیں۔(ناپید)(۱۵)

خیالستان میں شامل سبھی افسانے اور انشائیے کی سن اشاعت میں پروفیسر ثریا حسین کے مطابق دی گئی سنِ اشاعت اور مرزا حامد بیگ کے مطابق دی گئی سن اشاعت کی فہرست میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ملاحظہ ہو:

"'خیالستان' (سات افسانے، چھ مضامین اور ایک نظم) ادارہ "مخزن" میکلیگن روڈ، لاہور طبع اول فروری 1911ء۔ (۱) "قدرستان، گلستان" ("مخزن" میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ گلستان کے عنوان سے جلد 11 شمارہ 3 جون 1906ء کے صفحات 1 تا 11 پر اور شیرازدہ کے عنوان سے جلد 11 شمارہ 6 ستمبر 1906ء کے صفحات 1 تا 9 پر تیسری قسط کے اختتام پر ماخوذ بھی لکھا گیا ہے)۔ (۲) "دوست کا خط" "مخزن" کی جلد 12 شمارہ 1 اکتوبر 1906ء کے صفحات 9 اور 10 پر شائع ہوا۔ (۳) "غربت و وطن" ("اردوئے معلیٰ" علی گڑھ کی جلد 7 شمارہ 14 اکتوبر 1906ء میں شائع ہوا۔ (۴) چڑیا چڑے کی کہانی ("مخزن" کی جلد 13 شمارہ 1، اپریل 1907ء کے صفحات 7 تا 35 پر شائع ہوا) (۵) "نکاح ثانی" ("مخزن" کی جلد 12 شمارہ 3، جون 1907ء کے صفحات 22 تا 45 پر شائع ہوا)۔ (۶) "حکایہ لیلیٰ و مجنوں" ("مخزن" میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ پہلی قسط جلد 14 شمارہ 1، اکتوبر 1907ء کے صفحات 9 تا 23 پر دوسری قسط جلد 15 شمارہ 1، اپریل 1908ء کے صفحات 19 تا

26 پر اور تیسری قسط اسی جلد کے دوسرے شمارہ (مئی 1908ء) کے صفحات 12 تا 19 پر موجود ہے)۔(۷) "اگر میں صحرا نشین ہوتا" ("مخزن" کی جلد 14 شمارہ 3 دسمبر 1907ء کے صفحات 9 اور 10 پر شائع ہوا۔(۸) "سودائے سنگین" (پہلی قسط "مخزن" کی جلد 15 کے شمارہ 15 اگست 1908 کے صفحات 9 تا 20 پر اور دوسری قسط اسی کے شمارے (دسمبر 1908ء) کے صفحات 8 تا 22 پر شائع ہوئی۔(۹) "محبت ناجنس" ("مخزن" کی جلد 10 شمارہ 8 (فروری 1906ء) میں "لڑکیاں اور یورپی تربیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ ترکی افسانے کا ترجمہ ہے۔ (۱۰) "ازدواج محبت" (ترکی افسانے کا ترجمہ)۔" (۱۶)

بھلے ہی مرزا حامد بیگ نے اس تفصیل میں صفحہ نمبر، جلد نمبر اور شمارہ نمبر کے اندراجات درج کئے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کے مطابق پروفیسر ثریا حسین کے مطابق دیئے گئے سن اشاعت ہی مستند ہے کیونکہ "انتخاب سجاد حیدر یلدرم" کا مقدمہ قرۃ العین حیدر نے لکھا جو نہ صرف یلدرم کی بیٹی تھیں بلکہ اردو ادب کی ایک ذمہ دار ادیبہ بھی تھیں۔ افسوس کی بات ہے کہ آج "خیالستان" کے علاوہ یلدرم کی ساری تصانیف عرصہ دراز سے آؤٹ آف پرنٹ ہیں۔

افکار وخیالات:

یلدرم ترکی ادب کے دلدادہ تھے۔ ان کے چند افسانے، ناول اور ڈرامے ترکی ادب سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ جس کے ذریعے وہ اردو ادب میں ترکوں کی سوشل زندگی کا نقشہ پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس وقت ہندوستانی عوام جن حالات سے گزر رہی تھی ان حالات سے ترک قوم بھی گزر چکی تھی۔ یلدرم نے جس طرز خاص کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کے ساتھ جن نئے الفاظ کو انھوں نے برتا تھا وہ ترکی زبان کے تھے۔ ترکوں نے بہت سے محاورں، اصطلاحوں اور الفاظ کو یوروپین زبانوں سے لیا تھا۔ مثلاً فرانسیسی اور انگریزی سے اپنی زبان میں عربی یا فارسی کی مدد سے لیا تھا۔ سجاد حیدر نے ان کو اردو سے روشناس کرایا تھا۔ پطرس کے مطابق یلدرم نے جن کہانیوں اور ڈراموں کا ترجمہ کیا اس کا مقابلہ اصل تصانیف سے نہیں ہو سکتا ہے لہذا یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یلدرم صرف مترجم ہی ہے یا ایک نئی تکنیک کو برتنے پر انھوں نے اپنی طبعی انکساری کی وجہ سے تراجم بتایا ہے ملاحظہ ہو

> "یلدرم کی متعدد کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں۔
> لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اصل تصانیف سے ان تراجم
> کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس لئے میں یقین سے نہیں
> کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں
> مترجم کی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا
> حسن بیان ہے یا محض انکساری جو انھیں ایک نئی

تعصب برتنے کی معذرت کے طور پر برتا پڑا۔ چند
داخلی شہادتوں کی بناء پر مجھے شبہ ہے کہ تراجم دراصل
تقریباً طبع زاد تخلیقات ہیں۔ اور جیسا سمجھا جاتا ہے
اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان
کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے پس منظر نے دلائی۔
کیونکہ جدید مدنیت یوروپین کی بجائے ترکی لیبل
کے ساتھ کہیں زیادہ دلآویز نظر آسکتی تھی۔" (۱۷)

اپنی تخلیقات میں یلدرم نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ عورت کو پردے کے پیچھے سے جھانکنے کے بجائے اپنے ہمراہ اپنے برابر کھڑا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی کہانیوں کے خواتین کرداروں کو حویلیوں کی چہار دیواری سے نکال کر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنا چاہتے تھے۔ یلدرم پکے قوم پرست تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اسلام کی بے بسی کا جو عالم انھوں نے دیکھا تھا اس لئے وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلم ممالک ترکی کی برتری قبول کرے اور اس کی رہنمائی میں خاص طور سے ہندی مسلمان مغربی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرے۔ ان کی فکر غیر معمولی طور پر سیکولر تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا سوال ہو یا اردو ہندی رسم خط یا پھر ہندوستانی کہلانے کے مسائل پر یلدرم نے 1936ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سالانہ اجلاس کے لئے جو مقالہ لکھا تھا وہ قابل دید ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ وقت عنقریب آجائے گا اور جلد آجانا چاہیئے جب مذہب سے قطع نظر جغرافیائی اور ریجنل بنیادوں پر ان مسائل کا حل کیا جائے گا۔ رسم الخط کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ طرف سے

شمال مغربی حصے میں عربی رسم الخط اور باقی سارے ہندوستان میں لاطینی یا دیوناگری اسکرپٹ کا استعمال ہوگا۔ اتنا ہی نہیں تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، شاعری کے اسالیب میں نئے تجربے اور اردو ٹائپ کو مقبول بنانے کے لیے وہ تاعمر کوشاں رہے۔ تیز رفتاری سے بدلتی ہوئی زندگی اور سائنس کی دنیا میں ہونے والے ہر روز نت نئے تجربے پر یلدرم کی بہت گہری نظر تھی۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اس کی معلومات دیتے رہتے تھے ملاحظہ فرمایئے

"ابا جان پیدائشی مستقبل پرست تھے اور مجھے اس وقت اتنی عقل نہیں تھی کہ پیدائشی ماضی پرست ہوں۔ ایک روز ناشتہ کرتے ہوئے ابا جان بھائی سے کہنے لگے "بہت جلد انسان چاند پر بھی پہنچ جائے گا ہم تو زندہ نہیں ہوں گے۔ مگر آپ لوگوں کے سامنے ہی سائنس بے حد ترقی کرے گا۔ پھر جناب آپ اور بی بی دلی میں بریکفاسٹ کیجیے گا لندن میں لنچ اور چاند پر ڈنر۔" (۱۸)

سفر :

یلدرم سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ انھوں نے اندرون ملک کے علاوہ بیرونی ممالک کے بھی بہت سفر کیے۔ اندرون ملک یلدرم نے جتنے بھی سفر کیے وہ بغرض ملازمت یا دوستوں و رشتہ داروں سے ملاقات کی غرض سے کیے۔ جن شہروں کا یلدرم نے

سفر کیا ان میں مدراس، بمبئی، مراد آباد، میرٹھ، حیدر آباد (دکن)، الہ آباد، لاہور، کراچی، دہرہ دون، مسوری، لکھنؤ، کوہاٹ، غازی پور، پٹنہ، نینی تال اور جزائر انڈمان نکوبار شامل ہیں۔

بیرونی ممالک کے سفر میں یلدرم نے پہلا سفر بغداد کا بغرض ملازمت کیا۔ اس کے بعد انھوں نے بطور سیاح 1911ء میں قاہرہ و قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ 1924ء میں جب وہ علی گڑھ میں بہ حیثیت رجسٹرار مقیم تھے اس وقت انھوں نے چھ ماہ کی چھٹی لے کر یورپ کے جن مقامات کی سیاحت کی ان میں عدن، POMPEII، VESUVIUS، ROMA، VATICAN، جینوا، نیس، سوئٹزرلینڈ، لندن، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، قسطنطنیہ، انگورہ جیسے مقامات شامل ہیں۔ دراصل اس سفر کی غرض یہ تھی کہ جرمنی نے اس وقت اورینٹ ایکسپریس نامی مشہور ٹرین شروع کی تھی۔ جو ایک سو بیس میل فی گھنٹہ رفتار سے چلتی تھی اور برلن سے استنبول جاتی تھی۔ یلدرم کی خواہش تھی کہ وہ اس ٹرین میں سفر کرتے ترکی جائیں ان ہی دنوں لندن میں Exhibition بھی چل رہی تھی جس کو وہ اپنی بیوی کو دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ وہ ان کے ساتھ نہ جا سکیں۔

خالدہ خانم ادیب اس وقت قسطنطنیہ یونیورسٹی کی وزیر تعلیم تھیں۔ یہاں پہنچنے پر انھوں نے یلدرم سے فرمائش کی کہ وہ طلباء سے خطاب کریں چنانچہ یلدرم نے ترکی زبان میں ایک لیکچر "ترکیہ کل اور آج" دیا جو پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا۔ یہاں سے یلدرم بذریعہ ریل دیگر شہروں سے گزرتے ہوئے اڈانہ پہنچے جہاں زمانہ بغداد کے ترک دوست فخری بے بہ حیثیت جنرل فخری پاشا مشرقی گورنر تھے۔ انھوں

نے یلدرم کے یہاں پہنچتے ہی وی۔ آئی۔ پی خیر مقدم کیا۔ اس واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''وزیر اعظم رؤف پاشا کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے یلدرم جس وقت ادانہ ریلوے اسٹیشن پر اترے پلیٹ فارم پر فوجی بینڈ اور استقبالیہ کمیٹی موجود پائی۔ سوچے کوئی غیر ملکی وی۔ آئی۔ پی اس ٹرین پر یورپ سے آیا ہوگا۔ اتر کر ایک طرف کو ہوئے۔ بینڈ بجنا شروع ہوا۔ متوقع رہے کہ اب یوروپین وی۔ آئی۔ پی ٹرین سے اترے گا۔ جنرل فخری پاشا نے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ تعجب سے دریافت کیا۔ آپ کو یقین ہے کہ آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مجھے کوئی اور شخص سمجھ کر یہ دھوم دھڑکا کر رہے ہیں۔

بعد ازاں ادانہ ملٹری کالج میں استقبالیہ جلسہ ہوا۔ ہندوستان واپس پہنچ کر بوجہ منکسر المزاجی کسی سے ادانہ کے واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ہمدرد کے نامہ نگار مقیم قسطنطنیہ نے خبر بھیجی جو مولانا محمد علی نے شائع کی۔'' (۱۹)

ادانہ سے یلدرم نے حلب، دمشق اور بیروت کا رخ کیا اور اکتوبر 1924ء میں ہندوستان لوٹ آئے۔ چند سال بعد 1929ء میں یلدرم نے ایک بار پھر

سیاحت کے لئے بیرون ممالک جانے کا پروگرام بنایا اور ایران، عراق اور ترکی جیسے ممالک کا انتخاب کیا۔ اس دفعہ اہل خانہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یلدرم کی ایک خوبی یہ تھی کہ جب کبھی وہ سیاحت کی غرض سے بیرون ممالک جاتے جانے سے پہلے اپنے چھوٹے بھائیوں سے مل کر ضرور جاتے تھے۔ لیکن اس سفر پر روانہ ہونے سے قبل ان کے پیر میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا جو گاؤٹ کا پیش خیمہ تھا۔ پھر دانت میں درد بھی اور شدت کے بخار نے آن گھیرا۔ ایک ہفتہ بعد ان کی طبیعت سنبھلی اور جونہی وہ ٹھیک ہوئے فوراً ایران چل دیئے۔ ایران کے بعد تہران اور بغداد کی بھی سیر کی۔

فروری 1934ء میں ایک مرتبہ پھر یلدرم نے بطور سیاح یورپ اور ترکی جانے کا پروگرام بنایا لیکن اچانک ہی دل میں حج کرنے کی خواہش جاگی اور بیت اللہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ 4 مارچ 1934ء کو بمبئی سے روانہ ہونے سے قبل حج کمیٹی نے انہیں اس جہاز کا امیر الحج مقرر کر دیا۔ یلدرم نے ملک سے باہر آخری سفر 1942ء میں افغانستان کا کیا اور یہاں کے پرفضا مقامات میں چند مہینے قیام کر کے لوٹ آئے تھے۔ یلدرم کے پسندیدہ شہروں میں قسطنطنیہ کے بعد بوڈاپسٹ شامل تھے۔

وفات:

10-11 اپریل 1943ء کی درمیانی رات دو بجے دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ہمیشہ سے یہ تمنا تھی کہ ان کے آخری وقت کی بیماری زیادہ طویل نہ ہو کہ دوسروں کو ان سے پریشانی ہو۔ ان کی تدفین لکھنؤ کے عیش

بدن قبرستان میں عمل میں آئی۔

یلدرم کو شاید اپنی وفات کی آگہی ہو چکی تھی اور اپنی طبعی عمر تک پہنچتے ہی وہ چاہتے تھے کہ اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کر دے۔ اس لیے وہ وصیت نامہ بھی تیار کروانا چاہتے تھے لیکن اہل خانہ کے جذبات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اس کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ انتقال سے چار دن قبل انھوں نے اپنی بیگم سے کہا تھا کہ بہت سا آٹا اور جنس منگوا کر گھر میں رکھ لو۔ جب نذر سجاد نے حیرت سے پوچھا کہ وہ کیوں تو جواب میں خاموش ہو گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا کل اثاثہ ایک لاکھ 36 ہزار کی مالیت کے شیرز، جو چارٹرڈ بنک آف انڈیا، آسٹریلیا اینڈ چائنا، شیس گیٹ لندن اور متعدد جنوبی افریقہ اور برما کی کانوں کے تھے چھوڑا تھا نقد رقم کچھ نہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک کوٹھی دہرہ دون میں ''آشیانہ'' چھوڑی تھی۔ یلدرم کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر ایشیاء میں بھی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت پاکستان نے شہر کراچی میں واقع پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کی ایک سڑک یلدرم کے نام منسوب کی ہے۔

شخصیت

سراپا:

یلدرم کا قد دراز تھا۔ وہ دبلے پتلے پھرتیلے شخص تھے۔ ان کا رنگ گورا اور ناک کھڑی تھی، چہرے پر ہر وقت شگفتگی اور بشاشت رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ پتلی تیلیوں والی عینک لگاتے تھے۔ غلام پنجتن علیگیات لکھتے ہیں:

''بدن میں پھرتی اور چہرے پر شگفتگی تھی۔ سوٹ

اور بلا تلیوں کی ناک پکڑنے والی عینک لگاتے
تھے۔" (۲۰)

شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

"دبلے پتلے۔ دھان پان۔ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے
گویا مہاتما گاندھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک
شرمیلی طبیعت ہے۔" (۲۱)

لباس:

وہ ہمیشہ اعلیٰ قسم کے سوٹ پہنتے تھے اور اکثر ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ جب کبھی سفر پر جاتے تب سولا ہیٹ استعمال کرتے تھے۔ انگریز سرکار کی تقریبوں شرکت کرتے وقت وہ دم والا کوٹ استعمال کرتے تھے۔ سید اظہار الحسن رقمطراز ہیں

"سید صاحب مغربی تہذیب کو پسند فرماتے ہیں۔
لباس قطعی انگریزی ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ترکی
ٹوپی زیب سر فرما لیتے ہیں۔ طرز معاشرت میں بھی
انگریزی تہذیب کی جھلک نمایاں ہے۔" (۲۲)

مزاج:

طالب علمی کے زمانے میں یلدرم بڑے شوخ اور تنومند رہتے تھے اور طرح طرح کی نت نئی سرگرمیوں میں ملوث رہتے تھے۔ یلدرم جب حاجی محمد اسماعیل خاں کے سیکریٹری تھے تب ایک دفعہ شبلی نعمانی ان کے یہاں مہمان ہوئے اور بنگلہ کے ایک

کمرے میں مشقِ سخن میں مصروف تھے کہ یلدرم کی نظر ان پر پڑی۔ ان کو فکرِ سخن کرتے ہوئے دیکھ یلدرم کو بڑا مزا آیا۔ وہ خود تو محظوظ ہوئے ساتھ ہی جب سر عبدالقادر وہاں سے گزرنے لگے تو یلدرم نے یہ نظارہ انھیں بھی دکھایا۔ لیکن جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تب وہ ثابت قدمی سے زندگی کے پیچ و خم کا لطف اٹھاتے رہے۔

یلدرم بڑے روشن خیال، بذلہ سنج، خوش طبع، ملنسار، منکسر المزاج اور بڑے شگفتہ مزاج انسان تھے۔ وہ بڑے متواضع اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ باوجود شہرت اور بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے ان کے مزاج میں رعونت نام کو نہیں تھی۔ اپنی تمام عمر انھوں نے بہت خاموشی اور نرم روی کے ساتھ گزاری جو بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی بھی تھی اور متانت بھی۔ یلدرم کے مزاج پر گہری نظر ڈالتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :

> "سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو کبھی ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہیں پایا۔ نہ ان کے منہ سے ایسے الفاظ سنے

جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے رچے ہوئے
آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان
میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔
ان آداب کو وہ اس لطف سے اور آسانی سے برتتے
تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے۔ یا ایک حسین
اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے۔ بغیر کسی ارادے یا
تکلف کے یلدرم میں رکی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان
کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی
تھی۔ وہ اس حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک
شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی
اسی حد تک ہوتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن
معاشرت کا جزو سمجھی جاتی ہے۔" (۲۳)

یلدرم کے ذات کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی تصانیف میں ذاتی زندگی کی جھلکیاں کہیں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً انہوں نے اپنی نجی زندگی کو اپنی ادبی زندگی سے بالکل علیحدہ رکھا۔ یلدرم اپنے اعلیٰ عہدوں پر فائز دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ان دوستوں کو فوقیت دیتے تھے جو عموماً عام لوگوں کی قطار میں آتے تھے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو

"ان کے مضامین یا فسانوں میں آپ کو مصنف کی
ذاتی زندگی کا ذرا سا حال بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ان

کی قوت تخیل ایسی قوی تھی اور جدت طبع کا یہ زور تھا
کہ ان کو اپنے ذاتی ماحول کو کام میں لانے کی
ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اور اگر وہ کام میں لاتے بھی
ہوں گے تو اس خوبی سے کہ جو تصویریں وہ ہمارے
سامنے پیش کرتے تھے وہ ان کے تصور کا نتیجہ معلوم
ہوتی تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو اپنی پبلک
یا سرکاری زندگی سے بالکل علیحدہ رکھا۔ وہ کچہری
اور دفتر میں عہدے دار اور مضامین و فسانوں میں
وہ ہمیشہ سجاد حیدر رہے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے مگر ظرافت
ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ان کی زندگی نامور
حضرات کی زندگی سے بہ حیثیت سیکرٹری وابستہ
رہی۔ ان کی تحریریں بارہا کرسی صدارت سے نشر کی
گئیں اور اخبارات میں تعریف کے ساتھ شائع
ہوئیں۔ مگر بڑے بڑے قومی جلسوں میں جب
جناب صدر اپنی تقریر پڑھتے تھے تو کسی کو کانوں کان
یہ نہ معلوم ہوا کہ اس تصنیف کا مصنف یہ ایک نحیف
الجثہ شخص ہے جو گم نام شخص کی طرح اس مجلس کے
ایک کونے میں بیٹھا اس طرح ادھر ادھر دیکھ رہا ہے
گویا اس تقریر سے اس کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اپنے

آپ کو گم نامی میں رکھنا "بڑا آدمی" کہلانے سے
بھاگنا "بڑے آدمیوں" کی صحبت چھوڑ کر بے تکلف
گمنام دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا اور ان کے
ساتھ خوش طبعی میں خاموشی سے حصہ لینا سید سجاد
حیدر صاحب کی ایسی خصوصیت تھی جو بہت کم
انسانوں میں دیکھنے آئی ہے۔" (۲۴)

جب کبھی ان کے سامنے یہ بحث چھڑتی کہ افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت یقیناً ایک موجد کی سی ہے اور نیاز فتح پوری اور سلطان حیدر جوش کی حیثیت ان کے مقلد کی ہیں تب وہ صرف ایک ہی فقرہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ "تعریف کی سب سے بچی شکل تقلید ہے۔" ان کی ذات میں بہت جامعیت تھی۔ وہ ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ یلدرم میں چاہنے اور چاہے جانے کی صلاحیتیں موجود تھی۔ جو قدرت بہت کم لوگوں کو بخشتی ہے۔ وہ ہونہار نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کر کے ان میں موجود قابلیت کو باہر کھینچ نکالتے اور ان کے فن کو سنوارنے میں مدد کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں علم و ادب کے شوق و ابھرنے کا جذبہ ہوتا اور نئی جہتوں سے روشناس کرنے کا ہنر ہوتا تھا۔ یلدرم کی شخصیت میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلیاں ہوئیں جو ان کی سیرت و شخصیت کا مستحکم بالشان پہلو ہے۔

یلدرم کی حیات سے جڑے ایسے کئی واقعات ہیں جس سے ان کی شخصیت میں چھپے عجز و انکساری کے جوہر کی عکاسی صاف طور پر ہوتی ہے۔ درج ذیل اقتباس

پر غور فرمایے

"بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہو گیا۔ یہاں یلدرم ترکی کے نئے ادب کی تحریک اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہے۔ اسی زمانے میں نوجوان وطن پرستوں نے ینگ ترک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ یلدرم خود بہت بڑے انقلابی تھے۔ یہ برطانوی فارن آفس کے ملازم تھے اور غلام آباد ہند کے باشندے تھے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ ینگ ترک پارٹی کی اولین میٹنگ آپ کے گھر پر ہی منعقد کی گئی اور خفیہ پولیس اور جاسوسوں کی نگرانی کے باوجود مستقل انڈر گراؤنڈ قسم کے جلسے اور کارروائیاں آپ کے یہاں ہوتی رہیں۔

یلدرم کی یہ انقلاب پرستی رومانیت کے جذبے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر ینگ ترک پارٹی کے ساتھ کام کیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بعد میں ساری عمر کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے خیال میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سنسنی خیز شہرت حاصل کرنے

کے لیے بعد میں ہمیشہ کے واسطے لیڈر قوم اور

غازی وغیرہ بن جاتا۔" (۲۵)

یلدرم میں قوت برداشت کا مادہ بھی بہت تھا۔ کتنی ہی بڑی پریشانی یا تکلیف کیوں نہ آئے وہ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی پیشانی پر کاربنکل نکل آیا جس کو آپریشن کر کے ان کے بھائی وحید حیدر نے نکالا تھا۔ آپریشن کے بعد شدید درد میں بھی انھیں کسی نے کراہتے نہیں دیکھا۔ انھوں نے اپنی کثیر الاشاعت کتابوں کی رائلٹی پبلیشروں سے کبھی نہیں لی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے میز کی ایک دراز سے منی آرڈر فارم نکلے جن سے وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو مختلف حاجتمندوں کو مختلف رقوم ارسال کرتے تھے۔ ان کے افراد خاندان کو بھی اس بات کی اطلاع نہ تھی کہ وہ کسے یا بھیجتے تھے۔

ایک دفعہ جب لندن میں یلدرم اپنے دوست مستان خیری کے یہاں قیام فرما تھے تب مستان خیری نے انھیں واشنگ مشین دکھائی۔ اسے دیکھ کر یلدرم بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں اپنے ساتھ ایسی مشین ضرور لے جاؤں گا اور اسے ہندوستان میں متعارف کراؤں گا۔ تاکہ ہماری عوام کو اس سے فائدہ پہنچے۔ سرکاری ملازمت کرنا یلدرم کی مجبوری تھی۔ لیکن وہ اپنی قوم اور ملک سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آزادی کے جیالوں کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان سے ملنے کی خاطر بڑے بڑے خطرے مول لیا کرتے تھے۔ جون 1920ء میں اودھ کے کسان زمینداروں کے مظالم کے خلاف احتجاجی مارچ کرتے ہوئے الٰہ آباد گئے تھے اور پنڈت نہرو نے ساتھ ان سے ملنے کے لیے پرتاب گڑھ اور اودھ جا رہے تھے اس وقت پرتاب گڑھ اسٹیشن پر

ان کی ملاقات سجاد حیدر یلدرم سے ہوئی۔ اس ملاقات کا ذکر پنڈت نہرو نے دسمبر 1920ء کے کانگریس اجلاس ناگپور میں شرکت کے لیے آئے عثمان حیدر (یلدرم کے بھانجے)، مولانا محمد علی، موتی لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، عمر سبحانی، سروجنی نائیڈو اور پنڈت کیلاش نرائن کے سامنے کیا تھا۔ اس کا خلاصہ قرۃ العین حیدر اس طرح پیش کرتی ہیں:

> ''جواہر لعل نے سروجنی نائیڈو اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مخاطب کر کے دفعتاً کہا صاحب وضعداری بھی بڑی چیز ہے۔ پچھلے دنوں میں لکھنؤ سے الٰہ آباد جا رہا تھا۔ پرتاب گڑھ کے اسٹیشن پر سجاد حیدر صاحب مل گئے۔ وہ شاید سلطان پور جا رہے تھے۔ اسٹیشن پر میری وجہ سے زبردست ہجوم تھا۔ سجاد صاحب دوسرے پلیٹ فارم پر تھے۔ بھیڑ کے دھکے کھاتے تیز تیز چلتے آ کر بڑی گرمجوشی سے ملے میں نے کہا جناب مجسٹریٹ صاحب اب سی۔ آئی۔ ڈی آپ کی مخبری کر دے گی۔ ہنس کر فرمایا دیکھا جائے گا۔
>
> میرا ایک پرانا دوست آج کل پرتاب گڑھ کا ایس۔ پی ہے۔ شاید میری وجہ سے پولیس کے انتظام کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ دور سے یہ

منظر دیکھ رہا تھا۔ میری نظر پڑتی تو فوراً آڑ میں ہو
جاتا۔ سجاد صاحب کی ٹرین کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔
وہ خدا حافظ کہہ کر اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے
تیز تیز چلتے پل کی طرف روانہ ہو گئے۔" (۲۶)

مشغلہ:

انٹرمیڈیٹ کے زمانے سے ہی سجاد حیدر مطالعہ کے عادی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مگر درسی کتابوں کو محض ضرورتاً پڑھ لیتے تھے۔ یوں تو یلدرم کو کتابوں کے علاوہ کسی اور چیز سے رغبت نہ تھی۔ لیکن وہ اکثر گلف (Golf) سے شغل فرمالیا کرتے تھے۔

عادت واطوار:

جب کبھی یلدرم اپنے خاندان والوں سے ملنے جاتے گھنٹوں بڑی بوڑھیوں، عزیزوں حتیٰ کے دور کے رشتہ داروں کے پاس بھی ملنے جاتے ان سے خوب باتیں کرتے اور ان کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گزاری لیکن کلب لائف اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے دونوں بھائیوں کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر دسترس حاصل تھی لیکن خود ان کو موسیقی کا زیادہ شوق نہ تھا۔ لیکن اپنے بچوں کو موسیقی کی تعلیم وتربیت کے خیال سے انھوں نے رام پور دربار کے استاد یوسف خاں کو کئی سال گھر پر رکھا۔ انھیں اخبار بینی کا چسکا تھا اور ریڈیو پر نیوز پابندی سے سنتے تھے۔ وہ

سگریٹ بھی پیتے تھے۔ صحت کے بار بار خراب ہونے کی وجہ سے نذر سجاد انھیں پرہیز کرواتی تھیں۔ جس کی وجہ سے پریشان ہو کر وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے گھر کا رُخ کرتے اور اپنی بھابیوں سے وہ تمام کھانے فرمائش کر کے بنانے لگاتے جو انہیں بہت پسند تھے۔

دوست احباب:

یلدرم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کے احباب کا تعلق ملک کے ہر کونے میں بسے افراد کے علاوہ غیر ملکی افراد پر بھی مشتمل تھا۔ ترکی کا گورنر جنرل فخری پاشا، مولانا شوکت علی، انڈین پولیٹکل سروس کے انعام الحق دہلوی، پٹنہ کے نواب زادہ مرتضیٰ علی خان، مراد آباد کے سر محمد یعقوب، عبدالرحمن صدیقی، لکھنؤ کے سر سید وزیر حسن، مشتاق احمد زاہدی ان کے بے حد چہیتے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی کسی سے رنجش نہیں تھی۔ پریم چند، قاضی عبدالغفار، سر تیج بہادر سپرو، میر غلام بھیک نیرنگ، سر شیخ عبدالقادر، علامہ تاجور نجیب آبادی، سر سید رضا علی، مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، مولانا شمس العلماء مولوی ممتاز علی ان کے عزیز دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور نئی نسل میں وہ خواجہ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی کو بہت پسند کرتے تھے۔

یہ تو وہ چند نام ہے جو ان کی حیات سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی حضرات ہیں جن سے یلدرم کے تعلقات بہت گہرے تھے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں

"ویسے ان کا احباب کے حلقہ اتنا وسیع تھا کہ مجھے
معلوم نہیں اور کتنے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔
بہت سے لوگوں کو جنھیں میں نے بالکل
اجنبی سمجھا، یلدرم کا نام آتے ہی واقعتاً آنسو بہاتے
دیکھا ہے۔" (۲۷)

ان کی وفات پر ان کے دوست واحباب نے کئی مضامین اور نظمیں لکھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ جلیل قدوائی کی لکھی گئی ایک غزل "یاد یلدرم" ملاحظہ فرمائیے

یاد یلدرم

آہ سجاد حیدر یلدرم

ادب چمن ہے تو اس کی بہار تھا سجاد — عروس علم و ہنر کا سنگار تھا سجاد
لطیف صنف ادب کے جین تن سے قائل — لطیف صنف کا پروردگار تھا سجاد
ادب کے باغ میں یوں تو بہت ہیں لالہ وگل — مثال فوج نسیم بہار تھا سجاد
گرچہ اہل قلم کو کہیں ادب کو لڑی — تو اس لڑی میں ذرِ شاہوار تھا سجاد
بڑھا وہ مرکب شہرت پہ یوں کہ گر نہ سکا — رہ ادب کا عجب شہسوار تھا سجاد
نئے پرانے سب ہی اہل علم مان گئے — ادب میں وہ زر کامل عیار تھا سجاد
وہ اس کا طرز نگارش کہ دل میں گھر کر جائے — ادیب تھا کہ کوئی سحر کار تھا سجاد
ادب میں اس کی اور چمک نہ ہو کیوں کر — کہ ترجمان دل بیقرار تھا سجاد
زبان کو رنگ رنگ کو زبان بخشی — فسوں طراز تھا معجز نگار تھا سجاد
اگرچہ پیر تھا وہ، ادب جوان اس کا — خزاں میں مثل گل نو بہار تھا سجاد

حسین ادب تھا حسین تر تھی زندگی اس کی — ادب کا آپ خود آئینہ دار تھا سجاد

ادیب تھا اور ادیبوں کا سرپرست بھی تھا — ثبوت یہ ہے مرا غم گسار تھا سجاد

جلیل اس کی میں رحلت پہ خون کے آنسو

نہ کیوں بہاؤں کہ یاروں کا یار تھا سجاد

(۲۸)

یلدرم کے ان اجتہادات سے کسی کو انکار نہیں لیکن اس اعتراف کے باوجود ان کی شخصیت اور فن پر کام نہیں ہوا۔ آج ان کی بیشتر تالیفات دستیاب نہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''خیالستان'' کا بھی کوئی اچھا ایڈیشن موجود نہیں ہے اور نہ کسی ادبی رسالے نے ان کے شایان شان کوئی نمبر مرتب کیا۔ یلدرم کے ایک شیدائی سید مبارز الدین رفعت نے ''سجاد حیدر یلدرم'' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب 1946ء میں لکھی جو غیر معروف رہی۔ 1961ء میں رسالہ ''پگڈنڈی'' امرتسر نے ''یلدرم نمبر'' مرتب کیا۔ کچھ وقفہ بعد ڈاکٹر سید معین الرحمن نے ۱۹۷۱ء میں ''مطالعہ یلدرم'' عنوان کے تحت کتاب مرتب کی آج یہ کتابیں بھی بمشکل دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۱ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے اشتراک سے علی گڑھ میں دو روزہ یلدرم سمینار منعقد کیا ہے۔

حواشی

۱۔ مشتاق احمد زاہدی "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 20-19

۲۔ پطرس بخاری "سید سجاد حیدر یلدرم" روزنامہ اسٹیٹسمین کلکتہ مئی 1943، مشمولہ "کارِ جہاں دراز ہے" قرۃ العین حیدر ص 127

۳۔ سید اظہار الحسن "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 82

۴۔ کارِ جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر ص 19-18

۵۔ قرۃ العین حیدر "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "اردو کے بہترین شخصی خاکے" (جلد دوم) مرتبہ مبین مرزا ص 536

۶۔ عبدالماجد دریابادی "سجاد حیدر یلدرم" صدق 26 اپریل 1943، مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 100

۷۔ "علیگڑھ منتھلی نیوٹ رٹ مع تہذیب الاخلاق ۲۹ مارچ ۱۹۰۴، ص 17" مشمولہ "انتخاب سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ پروفیسر ثریا حسین ص 62

۸۔ گنج ہائے گراں مایہ از رشید احمد صدیقی ص 210-209

۹۔ مشتاق احمد زاہدی "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 12-11

۱۰۔ اماں باغبان مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 35-34

۱۱۔ سر سید رضا علی ''سجاد حیدر یلدرم مرحوم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 72

۱۲۔ کار جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر ص 401

۱۳۔ سر سید رضا علی ''سجاد حیدر مرحوم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 70-71-72

۱۴۔ قاضی عبد الغفار ''سجاد ــــ یلدرم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 56-57

۱۵۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ پروفیسر ثریا حسین ص 10-11-12-13-14

۱۶۔ اردو افسانے کی روایت 1903ء۔ 2009ء از مرزا حامد بیگ ص 283

۱۷۔ پطرس بخاری ''سید سجاد حیدر یلدرم'' روزنامہ اسٹیٹسمین، کلکتہ مئی 1943، مشمولہ ''کار جہاں دراز ہے'' قرۃ العین حیدر ص 127

۱۸۔ کار جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر ص 402

۱۹۔ ایضاً ص 256

۲۰۔ غلام پنجتن ''اردو علم و ادب کی جان'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 110

۲۱۔ شوکت تھانوی ''سجاد حیدر یلدرم'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 96

۲۲۔ سید اظہار الحسن ''سید سجاد حیدر'' مشمولہ ''سجاد حیدر یلدرم'' مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 81

۲۳۔ گنج ہائے گرانمایہ از رشید احمد صدیقی ص 219-218

۲۴۔ مشتاق احمد زاہدی "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 23-22

۲۵۔ قرۃ العین حیدر "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "اردو کے بہترین شخصی خاکے" (جلد دوم) مرتبہ مبین مرزا ص 543

۲۶۔ کارِ جہاں دراز ہے از قرۃ العین حیدر ص 236

۲۷۔ قرۃ العین حیدر "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "اردو کے بہترین شخصی خاکے" (جلد دوم) مرتبہ مبین مرزا ص 546

۲۸۔ جلیس قدوائی "یاد یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 99-98

☆☆☆

باب سوم

''خیالستان'' کا تجزیاتی مطالعہ

اور کب تک رہوں تاریک سیارے کا غلام

میں ترا نور ہوں آزاد کیا جائے مجھے

(اسد بدایونی)

سید سجاد حیدر یلدرم اردو افسانوی ادب میں بطور لیجنڈ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ شخصیت ہے جس نے اردو ادب کو نہ صرف مختصر افسانے سے متعارف کرایا بلکہ افسانوں کی دنیا کو رومانیت، جذباتیت اور افسانوں میں عورت ومحبت جیسے نرم و نازک احساسات کا تحفہ دیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے روست سماج میں عورت کا مقام اور عورت و مرد کی باہمی محبت کو موضوع بنایا۔ بلاشبہ انھوں نے ایک ایسا انداز اختیار کیا جس پر کہیں کہیں داستانوی اثر غالب تھا لیکن جن موضوعات کو انھوں نے برتا وہ نئے تھے۔

جس وقت یلدرم نے افسانہ نگاری کی شروعات کی اس وقت تک صنف افسانہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ ان کے سامنے کوئی باضابطہ تحریر یا طبع زاد افسانہ نہیں تھا۔ انھوں نے ترکی ادب کے چند افسانوں کا مرکزی خیال ہمارے افسانوں میں اس طرح شامل کیا کہ اصل تحریر بھی شرما جائے۔ ان کے افسانے چاہے ترجمہ ہو یا طبع زاد ایک نئے اسلوب کے حامل ہیں۔ ان کی نثر نگاری نے شروعات ہی میں اردو افسانے کو وہ مقام عطا کیا جہاں اردو ادب عالمی ادبیات کا حصہ بن گیا۔

ان کا پہلا افسانہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' رسالہ ''معارف'' میں اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا لیکن تنقید نگاروں نے سہل پسندی کا م لیتے ہوئے بنا تحقیق کے پریم چند کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کر لیا۔ کوئی سرسید کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتا ہے تو کوئی علامہ راشد الخیری کو۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے۔ یلدرم کے افسانوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''خیالستان'' ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ ''خیالستان'' میں شامل سب ہی افسانے اور انشائیے مجموعہ کی صورت میں چھپنے سے پہلے ہی مخزن اور اس وقت کے دوسرے نامور ادبی رسالوں میں چھپ کر مقبول عام ہو چکے تھے۔ مجموعی شکل میں آتے ہی یلدرم کی تحریروں کے شیدائیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اگلے اٹھارہ سال میں اس کے اٹھارہ ایڈیشن نکل گئے۔ اس کے باوجود آنے والے سال اس کی شہرت میں کمی نہ آئی اور لگاتار اس کے کئی ایڈیشن نکلتے چلے گئے۔ جس نے اس کتاب کو کلاسیکی ادب کا درجہ دیا۔ کسی بھی کتاب کے پندرہ ایڈیشن نکلنے کے ساتھ ہی اسے کلاسیکیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اس لحاظ سے بلاشبہ ''خیالستان'' کو کلاسیکیت کا درجہ حاصل ہے۔ ''خیالستان'' کے کتابی شکل میں آتے ہی مخزن جنوری ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

''چھپ کر تیار ہے

خیالستان

سجاد حیدر کے مختلف قصے اور مضامین سجاد حیدر

کے چھوٹے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے

گئے ہیں محتاج بیان نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے

فرمایئے

''یہ تحریریں مختلف موقعوں پر مختلف رسالوں میں
(زیادہ تر مخزن میں) شائع ہو کر قبول عام کا (شاید
یہ کہنا درست ہوگا کہ قبول خاص کا) تمغہ حاصل کر
چکی ہیں۔ سید صاحب میرے حال پر خاص التفات
فرماتے ہیں۔

اس اختصاص کی وجہ سے میں نے اصرار کیا کہ
ان تحریروں کا رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہونا (اور
وہ بھی بسا اوقات بے احتیاط ان کے لئے کافی
انصاف نہیں ہے۔) میں نے کئی دفعہ یہ گزارش کیا
کہ ان تحریروں کو ایک مجموعے کی شکل دی جائے
تاکہ خیالات کی ان بولتی چالتی تصویروں کا ایک
مرقع مرتب ہو جائے۔

میں خوش ہوں کہ میرے متواتر تقاضے نے آخر
اثر کیا اور سید صاحب نے یہ چھپوا دیا۔۔۔۔۔۔

علاوہ اس کے ان کی تحریروں میں ایک بڑی بات یہ
ہے کہ وہ صرف پر معنی ہی نہیں، بلکہ معنی خیز ہیں
صرف معنی خیز ہی نہیں بلکہ خیال انگیز ہیں۔ گویا یہ

میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی

جلوؤں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

آیئے اب "خیالستان" میں موجود افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

"خارستان وگلستان"

یلدرم نے "خارستان وگلستان" کے متعلق نوٹ لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ اس افسانے کا مرکزی خیال احمد حکمت کے افسانے سے لیا گیا ہے۔ یہ افسانہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ "گلستان وخارستان" جون 1906ء میں اور دوسرا حصہ "شیرازہ" ستمبر 1906ء میں رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوا۔ بھلے ہی اس افسانے کا مرکزی خیال ترکی افسانے سے لیا گیا ہے لیکن یہ افسانہ کسی طبعزاد افسانے سے کم نہیں۔ اس افسانے میں حقیقت اور خیالی دنیا کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ یہاں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ماورائی وفوق الفطرت عناصر بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> "'خارستان وگلستان' انشائیت، لطافت ونزاکت خیال کا مکمل نمونہ ہے۔ یلدرم نے اپنے زور قلم اور بے پناہ تخیل سے ایک ایسی تخلیق پیش کی جو خود

نسرین نوش کی نگہبانی کے لئے رات کی الگ پریاں ہوتی تو اس کے ساتھ دن گزارنے کے لئے سہیلیاں اور خادمہ پریاں الگ سے تھیں۔ کبھی سہیلوں کے ساتھ وقت گزارنا، تو کبھی پریوں کے ناچ رنگ سے لطف اندوز ہونا، کبھی ''دیارِ گل'' کی وادی کی سیر کے لئے جانا، کبھی شکار کرنا تو کبھی تیر اندازی کی مشق کرنا اس کے مشاغل تھے جن کی وہ تیرہ برس سے عادی تھی۔ لیکن اب وہ جس عمر کو پہنچ رہی تھی وہاں اس کے احساسات بدل رہے تھے۔ اس کے دل میں ایسی خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھی جس سے وہ واقف نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے معمول سے اکتانے لگی تھی۔ وہ کسی ایسی شئے کی متلاشی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس کے دل میں یہ تمنا ضرور تھی کہ کوئی ہو جو اسے دکھ دے اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اسے مسل ڈالے، ایک ایسی قوت اور جرات مند شے جو اس کے حسن و جمال سے متاثر ہوئے بغیر اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جزیرے کی ملکہ ہے، اس سے نہ دبے۔ اس کے رعب میں نہ آئے بلکہ اسے پکڑے، اسے مارے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

دوسرا حصہ ''خارستان'' ہے۔ جس میں آریاؤں اور ہندوستان کے قدیم باشندوں سے بھی قبل کے ایک قبیلے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ ان کی بے چین طبیعت انھیں ایک جگہ رہنے نہیں دیتی لہذا کچھ عرصہ بعد اس قبیلے کا ایک خاندان جزیرۂ سرندیپ سے نکل کر کسی نئے مستقر کی تلاش میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر روانہ ہوتا ہے لیکن سمندری طوفان سب کچھ ختم کر دیتا ہے۔ ساری کشتیاں غرق ہو جاتی ہے صرف ایک کشتی بچ جاتی ہے جس میں سوار سات نفوس ہیں اور ان ہی میں ایک خارا بھی ہے جو کہ رئیس قافلہ کا بیٹا ہے۔ یہ

جزیرۃ العرب کے جنوب مغرب میں ایک خالی جزیرے سے کشتی ہے۔ طوفان میں شامل سبھی عورتیں مر جاتی ہیں۔ ایک دو بچ جاتی ہیں وہ غم کے مصائب کی تاب نہ لاکر اور مر جاتی ہیں۔

یہ سات لوگ اس چار سالہ بچے کی پرورش کرتے ہیں۔ اسے جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک زیر زمین غار نما گھر بناتے ہیں۔ اسے شکار کرنا سکھاتے ہیں۔ خارا جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے جس چیز پر اس کا دل چاہتا ہے اسے توڑتا ہے، پھاڑتا ہے، مارتا ہے، اکھاڑتا ہے۔ اسی طرح کئی سال گزر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ جب خارا پہلی بار ایک بارہ سنگھا کا شکار کرتا ہے تو اس دن اس کے ساتھی خوشی سے جشن مناتے ہیں۔ یہ ایک ایسا جزیرہ تھا جہاں ہر طرف کانٹے اور پتھر ہی تھے۔ جب بھی بارش ہوتی بجلی کی چمک اور بادل کی گرج اس جزیرے کو گھیر لیتے۔ ان قدرتی آفات کے ساتھ شیر کی دھاڑ، ہاتھی کی چنگھاڑ اور درندوں کی چیخ و پکار سے ایک قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ کبھی اس جزیرے کے ایک طرف سے کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑتا تھا جس سے سارا ماحول خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

خارا اس اُجاڑ و بیابان جزیرے میں حیوانوں اور درندوں کے درمیان اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سیکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے، سینے پر ہزاروں مرتبہ خراشیں لگی تھیں اس کا چہرہ تمتما کے تانبا ہو چکا تھا۔ اب وہ عمر کے بیسویں حصہ میں قدم رکھ چکا تھا جس سے اس کے دماغ پر اکثر حسیات کا ہجوم ہوتا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ بہت بیمار ہوتا ہے تب ایک بوڑھا اس کی تیمارداری کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ جینا پریم ہے اور پریم عورت ہے۔ تب سے خارا اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر عورت کے

مجسمے تراشنا شروع کر دیتا ہے۔ چونکہ اس نے کبھی کسی عورت کو نہیں دیکھا ہے اس لئے وہ کبھی عورت کو تراش نہیں پاتا۔ لیکن اسے اپنی زندگی میں ہر وقت ایک خالی پن محسوس ہوتا ہے۔

''خارستان و گلستان'' کے بعد اس افسانے کا دوسرا حصہ ''شیرازہ'' ہے۔ خارا کے ساتھی اس حادثے کو نہیں بھول پاتے کہ وہ کتنی مشکلوں سے اس جزیرے تک پہنچے تھے۔ اس طوفان نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے جس کی وجہ سے اس سفر کے بعد انھوں نے دوبارہ کبھی سفر کا قصد نہیں کیا تھا۔ خارا اپنے دل میں اٹھنے والی کسک سے گھبرا کر بنا کسی کو کچھ بتائے ایک رات کشتی پر سوار ہو کر جزیرۂ خارستان سے بھاگ جاتا ہے اور اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دیتا ہے کہ ایسی زندگی گزارنے سے تو موت بہتر ہے۔

کچھ دور آنے کے بعد خارا کو ایک نقطہ دکھائی دیتا ہے اور وہ کشتی اس طرف ڈال دیتا ہے۔ آدھی رات ڈھلتے ہی اسے بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے جو اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس چاندنی رات کے اختتام تک خارا ایک انجان جزیرے پر پہنچ جاتا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔ یہ نسرین نوش کا جزیرہ تھا اور جزیرے کے اس کنارے پر وہ شکار کیلئے آئی تھی۔ خارا کو اس طرف آتے دیکھ نسرین نوش اس پر تیر چلا دیتی ہے۔ خارا زخم کھاتے ہی اس پر جھپٹ پڑتا ہے۔ دونوں عجب کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن چند لمحوں میں ہی سمجھ جاتے ہیں کہ دونوں ہم جنس ہیں۔

نسرین نوش، خارا کے پہلو سے تیر نکالتی ہے اور اس کے زخم کو دھو کر قریب سے چند پتے لا کر اس کے زخم پر رکھتی ہے اس کو پٹی باندھتی ہے۔ جوں ہی نسرین نوش،

بوڑھا دوائیں دیتا ہے، منتر پڑھتا ہے پانی چھڑکتا ہے۔ صبح کے وقت سارے چھوں ایک ایک کر کے جھڑتے ہیں اور نسرین خوشی ہوش میں آجاتی ہے۔ نسرین خوش کے آجانے سے اس جزیرے میں بہار آجاتی ہے۔ خدا کے ساتھی اپنے تمام عذابوں کو پل بھر میں بھول جاتے ہیں اور بوڑھا اس جوڑے کو دیکھ کر خوش ہوتا اور ناچنے لگتا اور کہتا ہے:

> ''عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرات اور عالی حوصلگی نہ ہوتی۔ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی ودلبری رائگاں جاتی۔'' (۲)

اس افسانے کا پلاٹ بھلے ہی داستانی طرز پر ہو لیکن اس کے ذریعے یلدرم نے ایک واضح حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی وجود کرۂ ارض سے ختم ہو جائے تو انسانیت ہی ختم ہو جائے گی۔ عورت چاہے کتنے ہی ناز ونعم میں پلے بنا مرد کے وہ ادھوری ہے۔ ویسے ہی مرد چاہے کتنا ہی بہادر کتنا ہی قجیعہ کیوں نہ ہو عورت کے بغیر وہ بھی تنہا ہے۔ اس افسانے میں موجود حقائق سے متعلق شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''یہاں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ خارستان اور گلستان جس کے تینوں نظریے شعور کے تین منطقوں سے تکمیل پانے والی ایک وحدت کا نقشہ جماتے ہیں، اس کی حیثیت ہماری ادبی فکر کے

ایک نئے موڑ کی ہے۔ نیز نے اعتراف کیا تھا کہ
اس افسانے کو پڑھ کر وہ ذہنی خصوصیت کی جانب
مائل ہوئے، یہاں حقیقت اور خواب و خیال کا
آمیزہ ایک ایسی انوکھی، پُراسرار تخلیقی کائنات کی
صورت گری کرتا ہے جس کا تمثیلی نسخہ تو نیا تھا
ہی لیکن جس نے افسانے کی روایت میں حقیقت
اور اس کے مناسبات کا تصور ہی تبدیل کر دیا۔ یہ
ایک آئینہ ہے جس میں آدمی کی جڑوں پر پھیلی ہوئی
کہانی کے سارے سمت آتے ہیں۔ ہمارے نقادوں
نے اس افسانے کی رومان پروری اور ماورائیت پر
بہت زور دیا، اگر یہ بھول بیٹھے کہ نسرین نوش اور خارا
کی یہ حکایت غریب جذباتی اور ذہنی مسرات کے
ایک نئے ادراک اور ایک نئی اخلاقیات کا پیش رستہ
بھی ہے۔" (۷)

مرکزی کرداروں میں خارا اور نسرین نوش اہم ہیں۔ خارا کی تربیت ایک ایسے جزیرے میں ہوئی جو انتہائی خطرناک ہے اور نسرین نوش نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا وہ نہایت حسین وہ دلفریب ہے۔ دراصل اس طرح کی طرز زندگی کا انتخاب یلدرم نے اس لئے کیا کہ وہ اپنے مقصد کو بیان کر سکے کہ عورت و مرد ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ افسانے میں نسرین نوش کی ماں، خارا کے ساتھی

اور دیو مالائی عناصر بھی ذیلی کرداروں میں شامل ہیں۔

منظر کشی یلدرم کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اس افسانے میں منظر نگاری کے کئی نمونے ہیں جس کے ذریعے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اس ماحول کا حصہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

"یہاں ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے اور پتھریلی زمین، اونچی چٹانیں، خوف ناک گھاٹیاں اس جزیرے کی اجزائے مرکب تھیں۔ جب کبھی آندھی اٹھتی تو جزیرے کے اونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کر کے شور مچاتی۔ کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے پتھر ازا کے طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے اور جزیرے کے درندوں کا شور، سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا۔ اس وقت اس گوشۂ عافیت یعنی خدا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا۔ خارا اور اس کے ساتھی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ ناامیدی، فکریں اور ڈر کے ساتھ اس وحشی نغمہ کو سنتے تھے اور کانپتے تھے۔" (۸)

افسانے کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ لیکن کہیں کہیں تشبیہ اور استعارات

کے ذریعے یلدرم نے ایک نئے اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ جو نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ افسانے میں سلاست، روانی جاری ہے جو قاری کو کسی پل بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس افسانے کے لئے یلدرم نے داستانی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

صحبت ناجنس

دو لڑکیوں میں خط و کتابت

اس افسانہ کو یلدرم نے 1905ء میں تحریر کیا تھا۔ لیکن رسالہ "مخزن" میں یہ افسانہ فروری 1906ء میں "لڑکیاں اور یورپی تربیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس افسانہ کا مرکزی خیال ترکی ادب سے لیا گیا ہے لیکن اس افسانہ کا انداز بیان مروجہ ترکی اسٹائل سے بہت مختلف ہے۔ اس میں یلدرم نے مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم کو پیش کیا ہے۔ افسانہ کے شروعات میں انھوں نے فرضی خط و کتابت کا سال 1925 تحریر کیا ہے۔ جس کے ذریعے وہ قاری کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس طرح کے حالات 20 سال بعد آسکتے ہیں۔ جس وقت یلدرم نے یہ افسانہ لکھا اس وقت وہ اپنے عہد کے لحاظ سے بہت آگے کی چیز تھا۔ اس افسانہ کی فصل بندی میں یلدرم کی انفرادیت قابل تعریف ہے۔ انھوں نے افسانے میں ایک ایسا منظر پیش کیا ہے جس میں افسانہ کا کردار عذرا اسکول میں پیانو پر انگریزی گیت گاتا سیکھتی ہے جو بعد میں لکھنے والوں کے لیے ایک ٹرینڈ بن گیا۔ پروفیسر ثریا حسین رقمطراز ہیں

> "صحبت ناجنس (1905ء) جو خطوط اسٹائل اپنے
> وقت سے بہت آگے ہے۔ اور لگتا ہے گویا آج ہی
> لکھی گئی ہے۔ اسے اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ
> قرار دینے پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مرکزی
> خیال ترکی سے ماخوذ ہے۔ اس اعتبار سے اگر تفصیلی

> جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار سے لیکر آج کے متعدد جدید ترین ادیبوں تک کی چند ایک تخلیقات کسی نہ کسی بیرونی ناول یا افسانے سے متاثر ہوئی ہیں۔ منشی پریم چند کا پہلا افسانہ "عشق دنیا وحب وطن" (زمانہ اپریل 1908ء) جو اطالوی قوم پرست میزینی اور اس کی سوئس محبوبہ میگڈ الین سے متعلق تھا۔ غالباً کسی انگریزی مضمون پر مبنی تھا۔ جدید اردو افسانے کے معماروں میں سے محمد حسن عسکری کے افسانوں "مراجی دی" اور "چائے کی پیالی" کو چیخوف نے "اسکول مسٹریس" اور "اسنپ" نے غلام عباس کا "ناک کاٹنے والے" کو ہیمنگوے اور عزیز احمد کے "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" کو ہیرلڈ لیمب نے انسپائر کیا تھا۔ اس طرح کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔" (۹)

افسانہ کا کردار عذرا جس کی شادی تین مہینے قبل ہوئی ہے اپنی سہیلی سمی کو خط لکھتی ہے اور اس سے اپنے حالات بیان کرتی ہے کہ اس کے ماں باپ نے اسے اچھی تعلیم وتربیت دی اور جس گھرانے میں اس کی شادی کی اس کے متعلق سب یہ رائے رکھتے تھے کہ لڑکی بہت خوش رہے گی۔ کیونکہ اس کا شوہر غیاث الدولہ اپنی دولت

کا مختارِ کل ہے۔ لیکن عذرا سوچتی ہے کہ کاش وہ بھی میری طرح پلا بڑا ہوتا۔ عذرا اور اس کے شوہر کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اسی بات کو یلدرم نے اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ہے۔ عذرا کی تربیت مغربی طرز پر ہوئی ہے وہ پیانو پر انگلش دھن بجاتی ہے اور Old long syne , Bul bul & the rose گاتی ہے۔ اس کے برعکس غیاث الدولہ کو امانت اور مداری لال کے ڈراموں کے اشعار پسند ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ داغؔ کی شاعری کا دلدادہ ہے۔ غیاث الدولہ اپنی بیوی کو حریص نظروں سے دیکھتا ہے اور کھانے کے بعد زور زور سے ڈکار لیتا ہے۔ شام میں نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتا ہے۔ ناکوں سے گانے گاتا ہے اور گھوڑے کی دوڑ پر جوا کھیلتا ہے۔ غیاث الدولہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتا۔ وہ بے انتہا باتونی ہے۔ یہ تمام ایسی عادتیں ہیں جو عذرا کے مزاج سے پوری طرح مختلف ہیں۔ یلدرم نے اس افسانہ میں غضب کی سراپا نگاری کی ہے جس سے غیاث الدولہ کا سراپا آنکھوں میں گھوم جاتا ہے ملاحظہ ہو :

> ''سراپا صحت ہے۔ اس قدر قوی کہ پہلوان معلوم ہوتا ہے۔ آواز بھری گویا ہاتھی پانی پی رہا ہے۔ بال موٹے موٹے، بڑی بڑی مونچھیں، چوڑی چوڑی بھویں، بابر کو نکلی ہوئیں بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی اور خوفناک، اس کے جسم و طبیعت کی تمام ہیئت مادی ان آنکھوں میں آ کر جمع ہو گئی ہے۔''(۱۰)

خط کے جواب میں سلمیٰ، عذرا کو شادی کی مبارک باد دیتی ہے اس کی شوخی اور شرارت کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے "تمہارا خط ایک تحریر نہیں بلکہ تم نے اس میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ عذرا سے اپنے حالات بیان کرتی ہے۔ اس کا شوہر حامد ایک انجینئر ہے جو انتہائی کم سخن ہے۔ وہ جب بھی گھر آتا ہے سلمیٰ سے بات نہیں کرتا کہ کہیں اس کی نیند نہ اڑ جائے۔ گھر کے تمام معاملات سلمیٰ کے سپرد کر کے وہ ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہے۔ سلمیٰ کو آزادی ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے بچوں کی پرورش کرے، گھر تبدیل کرے، سامان فروخت کرے یا خریدے یا کسی نوکر کو مقرر کرے یا نکالے۔ اگر سلمیٰ بیمار بھی ہو جائے تو ان کے مقررہ اوقات میں فرق نہیں آتا۔ سلمیٰ کو حامد کے ساتھ رہتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ حامد نے اسے جو آزادی دی ہے وہ دراصل بے پرواہی ہے۔

سلمیٰ کی دو لڑکیاں ہیں۔ حامد کو اگر گھر میں کسی چیز سے دلچسپی ہے تو ان لڑکیوں سے ہے جن کو وہ نقشہ بنانا اور سائیکل چلانا سیکھاتے ہیں۔ سلمیٰ اور حامد کی شادی کو بارہ سال ہو چکے ہیں اس عرصے میں انھوں نے کبھی بیوی پر توجہ نہیں دی ان کے روزانہ کا معمول یہ ہے کہ سونے کے لیے 9 گھنٹے، سرکاری کام کے لیے 7 گھنٹے، سیر و تفریح کے لیے 6 گھنٹے، اور گھر میں 2 گھنٹے، جس پر وہ باقاعدگی سے عمل کرتے ہیں۔

دراصل اس افسانہ کا مرکزی خیال میاں بیوی کے اختلافِ مذاق سے ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والی صورتحال ہے۔ بظاہر یہ افسانہ بے جوڑ شادی کے خلاف اپنا احتجاج درج کراتا ہے۔ جن میں والدین لڑکی کی مرضی کے بغیر انھیں ایسے

مردوں سے باندھ دیتے ہیں جن کا تعلیمی اور تہذیبی پس منظر مختلف ہوتا ہے اور وہ اپنی تمام تر مغربی تعلیم اور جدید خیالات کے باوجود ان مردوں سے نباہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اس مسئلہ پر یلدرم کے خیالات ملاحظہ ہو۔

> "پہلے بیاہ شادیوں میں کیا دیکھا جاتا تھا۔ یہی نا کہ
> برہمن کفو ہے یا نہیں، ایک برادری کا ہے یا نہیں،
> اس کفو اور برادری پر سب چیزیں قربان کر دی
> جاتی تھیں۔ کچھ اصلاح ہوئی کفو کا خیال ترک کر
> دیا گیا۔ تعلیم کا زور ہوا 'بر تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔
> "تعلیم یافتہ ہونا چاہیے" کا شور بلند ہوا۔ تھوڑے
> دنوں کے بعد اخلاق کی بھی چھان بین ہونے لگی۔
> بس یہاں پہنچ کر اصلاح رخصت ہوئی گویا اب کوئی
> کام باقی نہیں رہا۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا
> ہی نہیں۔ اصلی اصلاح تو جب ہے جب لڑکے لڑکی
> کے مزاج اور طبیعت کی مناسبت کی پوری پوری
> چھان بین کی جائے۔ خاوند اور بیوی دو ہم
> کپڑے کی ابری استر ہیں، ابری استر کے رنگ کی
> مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ دونوں
> ایک ہی رنگ کے ہوتے ہیں نہیں یک رنگی میں کوئی
> زینت نہیں، خیال یہ کیا جاتا ہے کہ یک رنگ

دوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔

بس اسی طرح لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال
لازمی ہے۔ امتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں،
طبیعتوں میں ایسا بین تضاد تو نہیں کہ میل ہونا مشکل
ہو۔ میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال
ہیں حسن و جمال، مال و دولت، تعلیم و تربیت سب کو
میں دوسرے درجہ پر رکھتی ہوں۔" (۱۱)

ایک اور اہم نکتہ اس افسانے میں غور طلب ہے کہ یلدرم نے جہاں عذرا کی شادی کو صرف تین مہینے کی مدت کا دکھایا ہے وہیں سلمیٰ کی شادی کو بارہ برس گذر چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کو ہم جماعت دکھایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یلدرم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو اور ان کا اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ عذرا اور سلمیٰ کا جذباتی لگاؤ محض ہم عمری کی وجہ سے نہیں بلکہ دو ایسی عورتوں کی داخلی نفسیات ہے جو ہر طرح سے بالغ و عاقل ہیں۔

اس افسانے کے کردار عذرا، سلمیٰ، غیاث الدولہ اور حامد ہیں جن کے مزاج اور عادات و اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ کردار مختلف و متضاد میلانات کے حامل ہیں جو اپنے طبقات کے نقوش کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

یلدرم نے اس افسانہ میں نہایت سادہ اور روزمرہ استعمال کی جانے والی زبان کا استعمال کیا ہے۔ اس افسانہ میں انھوں نے واقعات کو اس خوبی سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے کہ اس سے کرداروں کی فطری آہنگ اور ان کا نفسیاتی پہلو ابھر کر سامنے

آتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں

> ''صحبت ناجنس'' کی خوبی یہ ہے کہ زبان کی
> وضاحت اور خطوطی آہنگ اور واقعات کے معاصر
> انہ رنگ کے باعث اس کا نفسیاتی اور عمیق تر پہلو
> زیادہ تر مرکزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔'' (۱۲)

اس افسانہ میں یلدرم نے بہترین انداز بیان کے جوہر بکھیرے ہیں۔ کہیں کہیں تشبیہ کا استعمال کیا ہے جس سے ان کے جملے بہترین فن کا نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ درج ذیل مثال غور فرمایئے۔

> ''وہ لڑکپن کی امیدیں ایک لال کی بلبل پرواز کی
> طرح غائب ہو گئیں، اڑ گئیں۔ ایک چھوٹی چڑیا کی
> طرح ان کا خون ہو گیا۔'' (۱۳)

''صحبت ناجنس'' میں یلدرم نے مزاحیہ اور طنزیہ انداز بیان استعمال کیا جس سے سماج میں ہونے والی بے جوڑ شادیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ قاری اس تخلیق کو پڑھنے کے بعد جہاں لطف اندوز ہوتا ہے وہاں وہ ازدواجی زندگی میں در آئی تلخیوں کی شدت کو بھی محسوس کرتا ہے۔

خطوطی تکنیک اور شخصی تکنیک کا استعمال اس افسانے کو بہت جاندار بناتی ہے۔ اس افسانہ کی فضا بندی خطوطی تکنیک کے تحت ہی کی گئی ہے لیکن شخصی تکنیک کے زیر اثر مرد کردار کو قارئین سے متعارف کیا گیا ہے۔ مرد کردار یہاں آزاد حیثیت سے سامنے نہیں آتے بلکہ متعصب اور متاثرہ زاویوں کے ذریعہ ان کے خدوخال کو سامنے

لایا گیا ہے۔ خط کی تکنیک اس دور کے فکشن کی مقبول ترین تکنیک کہی جاسکتی ہے۔ انگریزی ادب کے سیموئل رچرڈسن (1761-1689) نے اس تکنیک کا استعمال اپنے تمثیلی قصے "پامیلا" میں کیا ہے اور لیو لیپے نے اس تکنیک میں اپنا افسانہ "آئینہ" میں آٹھ خطوط تحریر کیے تھے۔

ترک افسانہ نگار احمد حکمت مفتی اوغلو (1927-1870) نے 1905ء میں اس تکنیک کا استعمال کیا تھا۔ اردو ادب میں اس تکنیک کا استعمال سب سے پہلے راشد الخیری نے کیا۔ لیکن اس تکنیک کو اردو ادب میں شہرت یلدرم سے ہی ملی۔ اس افسانہ کا موضوع اتنا اچھوتا تھا کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس تکنیک کو ہی نہیں بلکہ اس موضوع کو بھی اپنایا۔ یلدرم کے بعد اس موضوع اور تکنیک پر لکھے گئے افسانوں میں پریم چند کا "دو سکھیاں" راشد الخیری کا "نند کا خط بھاوج کے نام" اہم افسانے ہیں۔

یلدرم دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ معاشرہ پر ان کا مشاہدہ گہرا تھا۔ ان کی نثر میں مستقبل کی وہ جھلک ہے جس کے ذریعہ وہ عورت کی زبوں حالی کو ختم کر کے اس کی حقیقت کو تسلیم کرنے اور اس کے جمال وقوت سے آگہی دلانا چاہتے تھے۔ یلدرم اس مسئلہ کو ایک وسیع تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ عورت اور مرد میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی قبل لکھا گیا یہ موضوع آج بھی اتنا ہی جاندار ہے۔

نکاح ثانی

یلدرم کا یہ افسانہ جون 1907ء میں رسالہ "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ جہاں انھوں نے ایک ایسے موضوع کو برتا جس کے ذریعہ نفسیات، گناہ اور شرافت جنس کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

افسانہ کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ ایک عورت رات کے وقت اپنی بچی کے ساتھ تخت پر لیٹی ہے اور اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہے۔ اس عورت کو ایک گمنام خط ملتا ہے۔ جس میں اس بیسوا کے گھر کا پتہ درج ہے جس سے اس کے شوہر کے تعلقات ہیں۔ عورت اس کشمکش میں مبتلا رہتی ہے کہ اس کاغذ پر یقین کروں یا نہ کروں۔ پھر وہ سوچتی ہے کہ اس کا شوہر جو ہر دوسری تیسری رات کو غائب رہتا ہے اور بہانے کرتا ہے کہ کچہری کے دوست کے یہاں دعوت میں تھا، فلاں جگہ جلسے میں تھا وغیرہ وغیرہ سب ایک بیسوا کو دل دینے کا باعث ہے۔ ساتھ ہی اس کاغذ پر یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اگر چاہو تو تحقیق کر لو۔ وہ کشمکش میں رہتی ہے۔ اسے اپنی سابق زندگی کے تمام واقعات یاد آتے ہیں۔ وہ ساری بے مطلب لڑائیاں جس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ساری تحقیریں اور اہانتیں جس کو وہ بھول چکی تھی۔

عورت اپنے زندگی کے وہ تمام واقعات یاد کرتی ہے کہ کب اور کس طرح وہ اپنے شوہر کی التفات اور محبت سے دور ہوتی گئی۔ اسے وہ وقت بھی یاد آتا ہے جب اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی اطلاع اپنے شوہر کو دی تھی۔ لیکن بجائے خوش ہونے کے وہ کہتا ہے "مگر بہت جلد" وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر دل کا برا نہیں ہے

بنادو اسے اس وقت بھی معاف کر دیتی ہے۔لڑکی کی پیدائش کے بعد مصروف ہو جانے پر وہ ان باتوں کی بھی عادی ہوتی چلی جاتی ہے جن کی وہ عادی نہ تھی۔ اپنے شوہر کے ہر عذر کو سچ مانتی ہے اور مطمئن رہتی ہے مگر یہ رات اس کے لیے بہت بھاری تھی۔ گذشتہ تمام راتیں جو اس نے اپنے شوہر کے آمد کے انتظار میں گذاری تھی اور آج کی رات کا تجزیہ اس طرح کرتی ہے

> ”یہ پہلی رات نہ تھی کہ وہ اکیلی تھی لیکن اور راتوں کو
> ایک فراغت نفس کے ساتھ اس تنہائی کو کاٹ دیتی
> تھی۔ کیونکہ اپنے دل کو اس خیال سے تسلی دیا کرتی
> تھی کہ باوجود چڑچڑے مزاج ہونے کے وہ میرا
> مفتون، میرا دلبند ہے اور اب بھی آئے گا تو میرا
> مفتون، میرا عاشق ہو کر واپس آئے گا۔ لیکن آج وہ
> تسلی کہاں، آج اس تسلی کو اس کاغذ کے ٹکڑے نے
> کس بے رحمی کے ساتھ پاؤں تلے روند دیا۔“(۱۴)

وہ عزم کرتی ہے کہ اپنے شوہر کو راہِ راست پر لا کر ہی دم لے گی۔ صبح ہوتے ہی وہ اس بیسوا کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ میں یہاں تم سے لڑنے نہیں بلکہ تم سے اپنا شوہر مانگنے آئی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ میں جانتی ہوں اس وقت وہ مجھ سے زیادہ تمھارا ہے۔ جب کہ وہ میرا شوہر ہے اسے صرف میرا ہو کر رہنا چاہیے۔ میرے سوا وہ کسی کی امانت نہیں ہے۔ تم بھی ایک عورت ہو اور ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ کسی کی بیوی کسی کی ماں بنے اور مجھے تمھارے در تک لانے والی شئے بھی میری بچی کی محبت

ہے۔ بات اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ بیسوا اس عورت کو مارنے کے لیے آگے آتی ہے۔ تبھی کواڑ کے پیچھے سے عورت کا شوہر باہر نکل آتا ہے اور اس بیسوا کو دھکیل دیتا ہے۔ وہ وہاں کچھ دیر پہلے ہی آکھڑا ہوتا ہے اور ساری باتیں سنتا ہے اور ساتھ ہی اپنی بیوی اور بیسوا کا موازنہ کرتا ہے۔ آخر میں بیسوا پر اپنی بیوی کو افضل پاتا ہے اور اپنی بیوی سے معافی مانگ لیتا ہے۔

یلدرم نے یہاں ایک ناخوشگوار حقیقت کی طرف حشر کیا ہے جو سماج کا ناسور ہے۔ اس افسانہ میں موجود واقعات جذبات سے پر ہیں اور ہر جذبہ اور ہر واقعہ کا تعلق پلاٹ سے بہت گہرا ہے۔ جذبات کے مختلف رنگ اور مختلف لہریں سامنے آتے رہتے ہیں لیکن موضوع کی وحدت برقرار رہتی ہے۔

اس افسانہ کا مرکزی کردار عورت ہے۔ جو ایک فاحشہ سے اپنے شوہر کو آزاد کرانا چاہتی ہے اور اس کی خاطر ایک ایسی عورت سے منتیں کرتی ہیں جس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔ یہ عورت صبر و تحمل کا پیکر ہے۔ وہ اپنے شوہر سے ملنے والی ہر بے وفائی کو معاف کر دیتی ہے وہ اس بیسوا کی خوشامد کرتی ہے لیکن جب وہ نہیں مانتی تب وہ اس کو اس کی زندگی کی حقیقت دکھاتی ہے۔ ملاحظہ ہو

"ہاں، ہاں! میں تمہیں تمہارے گھر میں ایک باتیں
سناتی ہوں۔ تمہاری جنگ کرتی ہوں، جانتی ہوں تم
پر عصمت والی بیبیوں محبت کرنے والی ماؤں کی
لعنتیں، بد دعائیں پڑتی ہیں۔ تم جو گھر کے چین،
بیبیوں کے آرام کی دشمن ہو، تم جو ہمارے خاوندوں

کو ہم سے نفرت سی ہو۔۔۔۔۔" (۱۵)

افسانہ میں فنیش ہیت اور خوبصورتی کی تخلیق ملتی ہے۔ اس افسانہ کی زبان سادہ اور مبہم ہے۔ یلدرم نے جن واقعات کا انتخاب کیا ہے وہ جذبات سے بھرے ہیں۔ خوبصورت اسلوب نگارش یلدرم کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اس افسانے کے متعلق عبدالودود لکھتے ہیں:

> "مصیبت زدہ عورت، پریشان حال و غمگین ہے۔ اس کے حرکات و سکنات کی کمال تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے غم و افسردگی کی حالت کی تصویر کشی جس طرح کی ہے اس سے اس کے جذبات نگاری کے شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ یلدرم صرف حسن و عشق کے جذبات کی ترجمانی کرنے ہی میں ماہر نہیں ہیں۔ بلکہ آلام و مصائب کا مختلف کرداروں پر جو اثر ہوتا ہے اس کی ترجمانی بھی بڑی کامیابی سے کرتے ہیں۔" (۱۶)

اس اقتباس کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یلدرم افسانہ نگاری کے فنی تقاضوں کو برتنے میں پوری مہارت سے کام لے رہے تھے۔ وہ فن افسانہ نگاری کے سارے رموز و فن سے واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں "ادب لطیف" جیسی بدعت کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور محض مترجم کا درجہ دیا جاتا رہا۔ انھیں پہلا افسانہ نگار کا درجہ دینے سے بھی گریز کیا جاتا رہا ہے۔ "خیالستان" میں شامل سبھی افسانے اور

ان کے موضوعات ایسے ہیں جو بعد کے افسانہ نگاروں کے لیے رول ماڈل ثابت ہوئے۔ ''نکاح ثانی'' بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے جو بعد کے لکھنے والوں کے دل پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا ہے۔ مثلاً صالحہ عابد حسین کا افسانہ ''سنبھالا'' کا پرتاپ، نیاز فتح پوری کا افسانہ ''ازدواج مکرر'' کا ذکی، ل۔احمد کا افسانہ ''ازدواج کی تقدیس'' کا کردار کمار، علی عباس حسینی کا کردار ''ڈاکٹر منور'' ایسے کردار ہیں جنھیں اپنی بیوی کی بے لوث اور پرخلوص محبت کا احساس سچے دل سے ہوتا ہے۔

سودائے سنگین

"سودائے سنگین" رسالہ "مخزن" میں اگست 1908ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ اس وقت تک لکھے جا رہے اردو افسانوں میں ایک الگ طرح کا تجربہ تھا جس میں ایک انسان کی نفسیات کو بہت کامیابی سے برتا گیا ہے۔ یلدرم کی یہ تخلیق ترکی ادب سے ماخوذ ہوتے ہوئے بھی طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔

اس افسانہ کا پلاٹ فرامرز جان جمشید کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ جو پارسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب فرامرز نہایت خوش خلق، مہذب اور دوست نواز ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج ایک نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ اس کی ملاقات راوی سے بمبئی کے قلابہ اسٹیشن پر ہوتی ہے۔ جسے دیکھ کر اسے نہایت حیرت ہوتی ہے کہ سال بھر میں یہ شخص کتنا بدل گیا۔ فرامرز کبھی ٹوٹے فقرے کہتا کبھی ایک ہی دفعہ میں اس قدر باتیں کرتا جس سے اس کے کرب میں گذرے ہوئے دنوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ افسانے میں فرامرز کا تعارف قاری سے اس طرح ہوتا ہے

> "فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ ایک شاعر
> تھا۔ حساً و فکراً شاعر اگر لساناً نہ ہو۔ اپنی تمام حیثیت
> معنویہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو نورِ شعر میں دیکھنا
> چاہتا تھا۔ یہ ان بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی
> مادیات کے تھپیڑے کھانے کے لیے پیدا ہوئے
> ہیں حالانکہ ان کا خستہ و مجروح اور ہائے ستم!

افسانے کے پلاٹ کی خوبی بیان کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں

> ''اگر ''خیالستان'' میں انھوں نے انسانی زندگی کے
> رومان اور جنسی فلسفہ کی شریعت کو ایک ایسی سطح مرتفع
> پر نہ پہنچا دیا ہوتا جو اوسط درجہ کے اہل قلم کی دسترس
> سے باہر ہے تو میں اُن کے تمام افسانوں میں ''سودائے سنگین'' کے روحانی حزنیہ کو ان کا سب سے بڑا
> شاہکار قرار دیتا۔ اس افسانہ کا اُٹھان بھی اس قدر
> بے تکان ہے کہ گویا اس کا لکھنے والا ''فرامرز'' کا نام
> لیکر فی الاصل خود اپنے وجود معنوی کی تصویر کھینچ رہا
> ہے۔ جو لوگ سجاد کی زندگی کے اندرون کی جھلک
> دیکھ چکے ہیں وہ دیکھیں کہ ''سودائے سنگین'' میں
> سجاد نے فرامرز کے وجود معنوی کا عکس جس نقش و
> نگار میں پیش کیا ہے اور اپنے اس افسانہ میں جو
> تصویر خانہ ترتیب دیا ہے وہ خود اُن کے وجدان اور
> اُن کی واردات سے کس قدر قریب ہے۔'' (۱۸)

فرامرز کا کردار افسانہ کے پلاٹ میں اس طرح سفر کرتا ہے کہ اسکے تشنہ جذبات و خیالات قاری کے سامنے کھل کر آجاتے ہیں۔ یلدرم نے فرامرز کے ذریعے اردو ادب کو ایسا کردار دیا ہے جو ہر عہد میں اپنے فطری جذبات کے سبب قارئین کے دلوں پر حکمرانی کرے گا۔

اس افسانہ میں یلدرم نے منظر نگاری کے بہترین مرقع پیش کیے ہیں۔ قدرتی مناظر ہو یا فرامرز کے جذبات کی عکاسی۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہوں

"اس وقت کچھ تاریک کچھ روشن حالات میں، میں نے دنیا کا سب سے عجیب اک کمرہ دیکھا۔ ساری دیواروں پر سرخ کاغذ لپٹا ہوا تھا اور ایک غیر منظم ہوس کے ساتھ دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں چینی کی رکابیاں جڑی ہوئی تھیں، بریکٹوں پر کہیں تاج محل کی سنگ مرمر سے بنائی ہوئی نقل۔ کہیں سنگ مرمر کے یا پیتل کے بت، کہیں پنکھے۔ غرضیکہ سیکڑوں طرح کی اور سیکڑوں رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک چینی کی رکابی تھی جس پر ایک تصویر منقش تھی۔ ایک گھنے کا جنگل ہے۔ اس میں ایک بارہ سنگھا ہے۔ جس کے سینگ ایک درخت کی شاخ سے الجھ گئے ہیں اور وہ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس رکابی کے پاس ہی ایک بریکٹ پر، ایک لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں جس کے اوپر سیپیاں چپکی ہوئی تھیں گنیش جی مہاراج کا بت رکھا ہوا تھا۔ ایک اور تصویر تھی جس میں ایک وحشی صورت

لڑکی تھی جس کا آدھا دھڑ سیاہ زمین میں غائب تھا
اور بالوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔
تصویر کے نیچے دو جاپانی پنکھوں کو کھول کے اور
دیوار میں گاڑ کے ایک عظیم تیتری کی شکل بنائی گئی
تھی۔ ان سب کے بعد ایک کونے میں لکھنے پڑھنے
کی میز، اس کے پاس ایک چھوٹی سی گول میز اور
ایک گھومنے والی کتابوں کی الماری۔ ان کے اوپر
مختلف گلاس، کاسے، البم، کاغذ، کتابیں تھیں۔
زمین پر قالین کے اوپر بھی چھوٹی بڑی کتابیں کھلی
اور بند پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ایک چیتے کی
کھال بچھی ہوئی تھی اور اس پر مختلف چیزیں بے
ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں۔ میز پر ایک گلدان میں
ایک عجیب سوکھا پودا لگا ہوا تھا۔ جس کے پتے
چھتری کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اس تمام گڑبڑ پر
اگر سو دفعہ نظر ڈالی جائے تو ہر دفعہ ایک نئی چیز نظر
آئے۔" (۱۹)

الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب یلدرم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ الفاظ کی تکرار اور متضاد الفاظ کی مدد سے وہ زبان کو خارجی وسیلۂ اظہار کے بجائے داخلی کیفیتوں کے تابع بنا کر پیش کرتے ہیں۔ درج ذیل مثالیں غور فرمائیں

"ایک سیاہی طاری تھی کہ بجلی اس سے جنگ کر رہی
تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
اہرمن اپنے لمبے ہاتھوں کے لمبے ناخن بڑھا بڑھا
کے کار زار کر کے سینۂ ظلمت کو پھاڑ رہا تھا۔"

"اب اس رات کے بعد ہر رات تاریکی میں لرزتی
لرزتی اپنے سر کو جھکاتی لڑکھڑاتی اور آتے آتے
وقت مقدر میں بڑھتی آتی ہے۔" (۲۰)

یلدرم اپنے افسانوں میں طرح طرح کی تراکیب اور تشبیہات استعمال
کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر وقت اپنے قارئین کو ایک نئے اسلوب سے روشناس
کرایا۔ اس افسانے کا اسلوب بھی نہایت جاندار ہے ملاحظہ ہو

"اس وقت اس کے شگفتہ چہرے کے اداس رخ پر
مسرت شباب کا غازہ ٹکٹکی جما ہوا تھا۔ آج ایک
انجمن میں ایک سانولے پن کے ساتھ ساتھ چہرہ
پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی ہلکی رنگ دار مونچھیں میں
جنھیں اس وقت وہ تاسف کا اظہار کرتی ناخن
سے سیدھی اور نوک دار بنایا کرتا تھا اور جن سے اس
کے چہرے کی ایک زنانہ ملاحت پر ایک مردانہ وقار
پیدا ہو جاتا تھا، آج ایک پریشانی تھی اور اضطراب
کی تکلیف دہ کیفیت کے ساتھ لٹکے ہوئے ہونوں

پر ایک تھکن برس رہی تھی۔" (۲۱)

اس افسانہ میں فلیش بیک اور بیانیہ تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ افسانہ میں نفسیاتی کشمکش بہت زیادہ ہے جس سے اس افسانہ کا شمار یلدرم کے اہم ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ نما انشائیہ " مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" رسالہ "معارف" میں اگست 1900ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا مرکزی خیال انگریزی ادب سے مستعار ہے۔ یلدرم نے چابک دستی اور ماہرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا کہ گمان ہوتا ہے یہ اردو نثری ماحول کا ہی حصہ ہے۔ اردو انشائیوں میں اس انشائیے کا درجہ اتنا بلند ہے کہ کئی نصابی کتابوں میں شامل ہو کر اس انشائیے نے کلاسک انشائیہ کا درجہ حاصل کیا۔ مضمون کی شروعات اس شعر سے ہوتی ہے

اور کوئی طلب ابنائے زمانے سے نہیں

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن مصنف کا گزر چاندنی چوک سے ہوتا ہے جہاں فقیر بھیک مانگتا ہوا گزرتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ مجھ بدنصیب کا حال سنو۔ سات بچوں کا باپ ہوں روٹیوں کا محتاج ہوں میں غریب الوطن ہوں میرا کوئی دوست نہیں۔ فقیر کی باتیں سن کر مصنف اپنی حالت کا موازنہ فقیر سے کرتا ہے کہ چہ معاملات میں، میں فقیر سے بہتر ہوں لیکن فقیر جس بات کو مصیبت خیال کر رہا ہے در اصل وہ نعمت ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا کوئی دوست نہیں تو وہ واقعی خوش نصیب ہے اور ایک میں ہوں جو اپنے دوستوں سے پریشان ہوں۔ یلدرم نے دوستوں کے ذریعہ پہنچنے والی پریشانیوں کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

"بھائی جان! دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔

مجھے اس وقت ضرورت ہے تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔
کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور
جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا
نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آرہے ہوں مگر
یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ
کہہ رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے
دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس
کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب
نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا
پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہوٹنگ
کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو
اسے جانا نہیں پڑتا اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت
نہیں کرتا؟" (۲۲)

اس کے بعد چند بے تکلف دوستوں کی عادت واطوار کو بیان کیا گیا۔ جن میں ایک صاحب احمد مرزا ہیں جو اس وقت آتے ہیں جب مصنف کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ احمد مرزا صاحب ایک طوفان کی طرح آتے ہیں اور ایک منٹ سے کم وقفہ کے لیے رکتے ہیں اور مصنف کے خیالات منتشر کر کے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے دوست محمد تحسین ہیں جو ایسے وقت میں اکثر چلے آتے ہیں جب مصنف تیسرے پہر کے قریب کام سے فارغ ہونے کے بعد تھکا ہارا آرام کرسی

پر خاموشی کے ساتھ ایک گھنٹہ آرام کرنے کا ارادہ کر رہا ہوتا ہے۔ تحسین صاحب جب
بھی آتے ہیں صرف اپنے بیوی بچوں کی بیماری کا ذکر کرتے ہیں اس کے علاوہ ان کے
پاس اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔

مصنف اپنے دوست محمد شاکر خان کا ذکر بھی کرتا ہے۔ جو موضع سلیم پور
کے رئیس اور ضلع بجنور کے معزز آدمیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ شاکر صاحب
مصنف کو بڑے اصرار کے ساتھ سلیم پور مدعو کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں کی آب
وہوا آپ کی صحت پر مثبت اثر ڈالے گی۔ ان کے اس خلوص پر مصنف وہاں پہنچتا ہے۔
چونکہ مصنف "ایڈیٹر معارف" سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ جلد ہی کوئی مضمون لکھ کر بھیج
دے گا۔ جیسے ہی وہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے کوئی نہ کوئی اسے پریشان کرنے کے لیے
آ جاتا ہے۔ کبھی شاکر صاحب کے بھائی کوئی تان چھیڑ دیتے ہیں تو کبھی میزبان
کھانے پر انتظار کر رہا ہوتا ہے تو کبھی میزبان کے یہاں کوئی ملنے آتا ہے تو اس سے ملوا
دیا جاتا ہے۔ مجبوراً مصنف ایک صفحہ بھی نہیں لکھ پاتا اور غصہ میں واپس لوٹ آتا
ہے۔ یلدرم نے اس انشائیہ میں چند ایسے دوستوں کا بھی نقشہ تراشا ہے۔ جس کا تجربہ
شاید ہر کسی کو ہوتا ہے مگر شکایت نہیں کر پاتا۔ ملاحظہ کیجئے

"ایک صاحب جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے مگر
جب آتے ہیں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ
حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک
صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب
میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں

ازدواجِ محبت

افسانہ کا پلاٹ اس طرح ہے کہ نعیم ایک ایم۔ڈی ڈاکٹر ہیں۔جنھوں نے کالج ختم کر کے اپنے والد کی مرضی سے انگلستان جا کر ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور آتے ہی ریاست حیدر آباد میں سول سرجن ہو گئے۔ان کے زیر نگرانی جتنے شفا خانے تھے ان میں ایک زنانہ شفا خانہ بھی تھا۔جس میں ایک مسلم لیڈی ڈاکٹر قمر النساء بھی تھی۔ اس وقت چونکہ عورتوں کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور مردوں سے بات کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا لہذا ہر کوئی اس سے بدگمان تھا۔اس کا کام نہایت عمدہ تھا اور کل ریاست کے زنانہ شفا خانوں میں اس کا شفا خانہ اول رہتا تھا۔دھیرے دھیرے نعیم کا جھکاؤ قمر النساء کی جانب ہونے لگتا ہے اور دونوں نہایت سادگی سے شادی کر لیتے ہیں۔جس پر لوگ انھیں لعن طعن کرتے ہیں اور دونوں نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ انہیں شہر بدر کر دیا جاتا ہے۔نعیم اور قمر النساء لکھنؤ چلے جاتے ہیں اور یہاں دواخانہ کھولتے ہیں لیکن وہ ٹھیک طرح سے نہیں چل پاتا اور ان کی مالی حالت خراب ہو جاتی ہے۔گھر کے سارے کام قمر النساء نہایت خندہ پیشانی سے کرتی ہے۔لیکن نعیم کا دل کڑھتا ہے کہ وہ قمر النساء کو کوئی سہولت نہیں دے پا رہا ہے۔

انھیں دونوں وہ امید سے ہو جاتی ہے اور نعیم اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ایک دن قمر النساء کہتی ہے کہ میرے دور کے رشتہ دار پٹنہ میں رہتے ہیں۔دونوں وہاں چلے جاتے ہیں۔دو تین دن بعد قمر النساء کے خالو نعیم کو ایک عالیشان کوٹھی میں لے جاتے ہیں جہاں وہ ملازم تھے یہاں قمر النساء ایک شہزادی کی طرح نعیم کے سامنے آتی ہے

گزار سکتا ہے۔ جس کا عملی ثبوت خود یلدرم نے دیا ہے۔ آج اردو افسانہ جس بلندی تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے اس کہانی کا پلاٹ بہت عام نظر آتا ہے لیکن اس دور کے پس منظر میں اگر ہم اس افسانے کا مطالعہ کریں تو یقیناً یہ موضوع نہایت اچھوتا، نرالا اور دل آویز معلوم ہوگا۔ ممکن ہے جس وقت یلدرم نے اس افسانہ کو تحریر کیا اس وقت ان کے ذہن میں صرف دو ہی نکات تھے ایک لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اور دوسرا لڑکیوں کو شوہر کے انتخاب کا حق۔ لیکن ہمارے نقادوں نے صرف اسی پہلو کی نشاندہی کی کہ یلدرم نے اس میں اعلیٰ طبقے کے کرداروں کو شامل کیا ہے۔ یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے اسے سب سے پہلے اعلیٰ طبقے ہی میں پذیرائی ملتی ہے بعد میں مڈل کلاس والے اسے اپناتے ہیں۔

افسانہ کے مرکزی کردار نعیم اور قمر النساء ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں۔ قمر النساء کے کردار کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ قمر النساء جو اتنی دولت و جائداد کی مالک ہے چاہتی تو کسی سے بھی شادی کر کے آرام سے زندگی گزار سکتی تھی لیکن وہ پڑھتی ہے ذہانت بھی ہے ساتھ ہی گھر کے کام کاج سے بھی واقفیت رکھتی ہے۔

قمر النساء کی طرح نعیم بھی ایک جاندار کردار ہے جو اپنے عہد اور معاشرے کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اپنے فرائض سے کبھی منہ نہیں موڑتا ہے بلکہ ہر قدم پر قمر النساء کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ جس وقت اس پر حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اس کی بیوی ایک ریاست کی مالک ہے اس کے باوجود وہ اپنی نیت خراب نہیں کرتا بلکہ اپنی طبابت جاری رکھتے ہوئے اپنی جائداد بناتا ہے اور قمر النساء کی جائداد کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

جس وقت یلدرم نے اس افسانہ کو تحریر کیا اس وقت تک افسانہ کی صنف وجود میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کے اجزائے ترکیبی کی حد بندی ہوئی تھی۔ لیکن اس افسانے کو پڑھنے کے بعد یلدرم کا فن دا کا حق دار ہے کہ انھوں نے مکالمہ نگاری کے ذریعہ اپنے مقاصد کو واضح کیا ہے ملاحظہ ہو

"آج کل پردے کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ تمہاری
اس کے متعلق کیا رائے ہے، جدید خیال ہو کہ کہنہ خیال
ہو؟ کہنہ خیال ہوگے، کیونکہ پردے کی مخالفت تو تم
سے قیامت تک نہیں ہونے کی۔"
میں نے کہا۔ "بے شک پردے کی مخالفت کو
صاحب عقل کر سکتا ہے۔"
"تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجیے کہ ہماری زندگی میں
دلچسپی نہیں۔"
"اس کو پردے سے کیا تعلق۔"
"آپ تعلق ہی نہیں! جب تک پردہ ہے، عشقیہ شادی
جس کے آپ اس قدر دل دادہ معلوم ہوتے ہیں ممکن
ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ بڑھے تو ماں باپ نے
جہاں ان کا دل چاہا بیاہ دیا۔ چوں وچرا کی گنجائش نہیں
اور ہو بھی تو کیا۔ نہ دیکھ سکتے ہیں نہ بات کر سکتے
ہیں۔ شادی کیا ہوئی سرکاری نوکری ہوئی۔ جہاں

سرکار کا دل چاہا نوکر بھیج دیا، حاکم کو ماتحت کی خبر نہیں،
ماتحت کو یہ معلوم نہیں کہ حاکم کیسا ملے گا۔ اس زندگی
میں راز سر بستہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں اور افسانوں کا
سلسلہ راز آخر میں جا کر کھل کیسے سکتا ہے؟ یہ سب
سچے عشق کی طفیل میں نصیب ہو سکتا ہے۔ روپیہ کے
لئے شادی مت کیجئے۔" (۳۳)

اس افسانہ میں یلدرم نے نہایت سادہ و سلیس انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان کی تحریر میں بلا کی روانی ہے جس سے قاری بوجھل پن کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کا اسلوب بہت شاندار، شائستہ، پر لطف اور پر اثر ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے فلیش بیک اور بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں

اس نظم کا تجزیہ باب چہارم میں "یلدرم کی شاعری" کے تحت کیا گیا ہے۔

چڑیا چڑے کی کہانی

"چڑیا چڑے کی کہانی" ایک تمثیلی افسانہ ہے۔ جو اپریل 1907ء میں رسالہ "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ طبع زاد افسانہ ہے۔

افسانے کا راوی ایک چڑا ہے۔ جس کی زبانی یلدرم نے انسانوں پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔ یوں تو چڑیا چڑے کی کہانی بہت انسانوں نے لکھی مگر یلدرم کہتے ہیں کہ اب چڑا انسانوں کی کچھ کمزوریوں کو بیان کرے گا۔ چڑا انسانوں کی کمزوریوں کو اس طرح گنتا ہے کہ انسان بہت بہانے باز ہے۔ وہ بہت باتیں بناتا ہے اور کرتا کچھ نہیں ہے۔ چڑا کہتا ہے کہ خدا نے مجھے مشاہدے کی قوت عطا کی ہے۔ جس کے ذریعے میں سب کچھ دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں اور کہتا بھی ہوں لیکن میری باتیں انسان نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے خدا نے مجھے آزادی طلب مخلوق بنایا ہے۔ بعض ایسی بھی مخلوق ہے جو انسانوں کی غلامی کرتا ہے۔ میں انسانوں کے درمیان رہ کر ان کی کارستانیوں پر نظر رکھتا ہوں۔

چڑا خدا کا شکر گزار ہے اپنی آواز پر نازاں ہے اور کہتا ہے کہ میں کسی کو دکھ نہیں دیتا اگر کہیں دانے ملے تو دوسری مخلوق کو بھی شریک کرتا ہوں سب آئیں اور کھائیں تنہا خوری میری عادت نہیں ہے۔ پھر وہ انسان کو ریا کار بتاتا ہے کہ ان میں مساوات نہیں ہیں۔ انسانوں نے بڑے اور چھوٹے کا فرق اپنے اندر پیدا کر لیا ہے۔ جس سے ہم لوگ پاک ہیں۔ چھوٹے طبقے والے لوگ بڑے طبقے والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں جس سے ان کی بے غیرتی معلوم ہوتی ہے اگر مجھے دربھی

ڈال گیا تو بھی اپنے ہم جنس اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کروں۔ انسانوں کی ریا کاری کا ایک پہلو چڑا یہ بتاتا ہے کہ مرد کی ریا کاری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے سامنے اپنی بیوی کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا اور نہ ہی گرمجوشی دکھاتا ہے۔ جو وہ تنہائی میں اس سے دکھاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ مردوں کی دل پھینک عادت کی طرف بھی طنز کرتا ہے۔ انسانوں کو لعنت ملامت کرتا ہے ملاحظہ ہو

"اب مجھے دیکھئے یہ کچھ غرور اور ستائش کے طور پر نہیں کہتا اور نہ اپنی پیاری چڑیا کو سنانے کے لئے کہتا ہوں، بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک بس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں، ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس سے ساتھ پیمان وفا باندھتا ہوں اور اس پیمان کو نہیں توڑتا، مگر یہ کہ موت آکے اسے توڑے۔" (۳۵)

آخری طنز چڑا انسانوں کی بے دردی کی طرف کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ذمہ داریوں کی طرف سے غفلت برتتے ہیں اور اپنی عیش پرستی میں اپنے بچوں کا خیال نہیں رکھتے۔ بلکہ بعض حضرات اپنے بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا نان نفقہ نہیں دیتے۔ جب کہ ان بچوں کو دنیا میں لانے کا باعث وہ خود ہیں۔ وہ کہتا ہے میں اپنے بچوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک وہ خود کمانا نہ سیکھ لیں۔ میں خود بھوکا رہتا ہوں مگر ان کا پیٹ بھرتا ہوں۔ اتنا بیدرد وہ ہو جاتا ہے۔

اس افسانہ کا راوی چڑا ہے جس کے ذریعہ یلدرم نے معاشرے پر طنز کیا اور چند مخصوص اخلاقی قدروں کی تبلیغ کی ہے۔ اس چڑے کی زبانی انھوں نے انسانی حرکات وسکنات کے غیر اخلاقی پہلوؤں کی اس طرح نشاندہی کی ہے کہ جس میں ظرافت و لطافت عروج پر ہونے کے ساتھ طنز کے نشتر بھی ہے۔ جو قاری کو جھنجوڑتے ہیں تاکہ انسان اپنے مرتبہ اور منصب سے آگاہ ہو سکے اور اپنے جائز حقوق کو حاصل کرے اور معاشرے میں جاری ظلم وجبر اور استحصال کا خاتمہ ہو۔

تمثیلی انداز ہونے کی وجہ سے افسانہ میں کہیں کہیں خطابت کا گمان گزرتا ہے اور جملوں میں اختصار سے کام لیا ہے۔ اس افسانے میں یلدرم نے چند ایسے جملے تحریر کیے ہیں جس میں بڑا زوردار اثر ہے جو سیدھے قاری کے دل پر وار کرتا ہے۔ ہوس کاری جسے انسان محبت کا نام دیتا ہے اس پر یلدرم نے گہرا طنز کیا ہے۔ انھوں نے "بس ایک" "پر زور دے کر" اور "مگر یہ کہ" لکھ کر جملے میں اختصار پیدا کیا جو گراں نہیں گزرتا بلکہ اس سے ایک طرح کی جدت پیدا ہوتی ہے۔

افسانے میں فضا بندی کے لئے یلدرم نے نہایت سادہ، سلیس اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے۔ یلدرم نے اس افسانہ میں تضاد کی تکنیک کو برتا ہے جو اردو افسانوں میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے یلدرم وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس تکنیک سے اردو افسانوں کو متعارف کرایا ہے۔ انھوں نے معاشرتی صورت حال کو مختلف جہتوں سے دکھایا اور انسانی منظر ناموں کو بے زبان کی نظر سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے ایک ہی نوع کے دو متکلم کے ذریعہ انسانی سماج کے تضادوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس افسانہ کے مطالعے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یلدرم اپنے گردوپیش کے

حالات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرتے تھے۔ اسی مشاہدہ کو انھوں نے اس خوبی سے اس افسانہ کا موضوع بنایا کہ اس سے جہاں ان کی جدت پسندی کا پتہ چلتا ہے وہیں انوکھے طرز بیان اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت دل کی سوانح عمری

اس انشائیہ کو یلدرم نے 16/دسمبر 1906ء میں تحریر کیا تھا جو رسالہ 'مخزن' میں فروری 1907ء میں شائع ہوا۔ اس انشائیہ میں انھوں نے حضرت دل کی سوانح عمری اس انداز میں درج کی ہے کہ دل کے مخصوص احساسات حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔

انشائیہ کی ابتداء میں حضرت دل اپنی سوانح لکھاتے ہیں اور کہتے ہیں میں بہت اثر پذیر ہوں۔ ہر چھوٹی بڑی شئے سے متاثر ہوتا ہوں۔ مثلاً نئی، پرانی، قدرتی، مصنوعی، باطنی، صوری، معنوی، جان دار اور بے جان۔ حضرت دل اعتراف کرتے ہیں کہ وہ حسن سے بے حد متاثر ہیں۔ جہاں کہیں کوئی حسین شے ان کے سامنے آتی ہے وہ مچل جاتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ زندگی کی ان حقیقتوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس دنیا میں آرام نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کی قسمت میں درد اور تکلیف ہی لکھی ہیں۔ گھٹنا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ان کا مقدر ہے اس دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب عیش کرتی ہیں ایک مجھے ہی سکون نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میری طبیعت میں تجسس بہت ہے۔ اس کے بعد حضرت دل ان کی زندگی میں آنے والی سب سے پہلی حسین چیز کو بیان کرتے ہیں کہ جس کا اثر ان پر اب تک باقی ہے۔ جو شفقت اور رقت، روحانیت و انسانیت کی دیوی یعنی "ماں" ہے۔ "ماں" وہ ہستی ہے جو اپنے بچے کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ یہاں حضرت دل کے جذبات کچھ اس طرح ہوتے ہیں:

"قدرت کی یہ سب سے نرم اور شفیق چیز مجھے بہت
ہی پیاری معلوم ہوتی تھی اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں
اس کے پیارے چہرے کو دیکھنے کے لئے رویا
ہوں اور مجھے گود میں اٹھالیا گیا ہے اور یہ خیال کر
کے کہ میں بھوکا ہوں مجھے دودھ پلایا گیا ہے۔
حالانکہ اس کی بالکل ضمانت نہ تھی۔ میں بس اس کو
دیکھنے، گھنٹوں اس فرحت بخش، طمانیت بخش، محبت
پاش، الفت انگیز چہرے کو اس چہرہ کو مجھے عالم لا
ہوتی کی صورتوں کی جنہیں میں ابھی چھوڑ کے آیا
تھا، یاد دلاتا تھا، دیکھنے کا خواہشمند تھا، کبھی میں اس
حسین شے کے سینے سے لپٹنے کی خواہش کرتا تھا
لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ صرف ہمکتا تھا، اور وہ شفقت
درد حانیت کی پری، خدا ہی جانتا ہے میری خواہش کو
کس طرح سمجھ لیتی تھی اور مجھے سینے سے لگا لیتی تھی
اور اس وقت میں وہ خوشی محسوس کرتا تھا جو دنیا کی
تمام خوشیوں سے بالاتر ہے میں جب اس کے سینے
سے لگتا تھا تو مجھے معلوم ہوتا تھا اور یہ معلوم ہو کے
مجھے کیسی خوشی ہوتی تھی کہ میں اس کے سینہ میں بھی
دھڑک رہا ہوں۔ وہاں بھی تڑپ رہا ہوں۔"(۲۶)

بیان کیا ہے۔ مشرق میں حضرت دل کو یہ شکایت رہتی ہے ان پر ہر طرف سے حملہ ہوتا ہے جو براہ راست نہیں ہوتا بلکہ گاڑی کی جھلملیوں میں سے جھروکوں میں سے، کھڑکیوں میں سے، گھونگھٹوں میں سے اور آنچلوں میں سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں کھلے عام تیر برسائے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا کام یہی ہے یہ نہ شرماتے ہیں اور نہ بزدلی دکھاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تیر تو چلاتے ہیں لیکن صاف نکل بھی جاتے ہیں۔ ابھی حضرت دل اپنے خیالات قلمبند کرا ہی رہے تھے کہ انھیں کوئی ایسی خلقت نظر آتی ہے کہ وہ خود رفتہ ہو کر بے قابو ہو جاتے ہیں اور سوانح عمری ادھوری رہ جاتی ہے۔

اس انشائیہ میں یلدرم نے سادہ الفاظ میں خوبصورت اظہار بیان کیا ہے۔ یلدرم موضوع کے مطابق اسلوب کا استعمال کرتے ہیں۔ موضوع جذبات کے اظہار کا طلب گار ہوتا ہے اس لئے اس انشائیے کے لئے یلدرم نے لطیف پیرائے کو اپنایا ہے اس کے متعلق ڈاکٹر شہناز عبدالودود لکھتے ہیں

> ''حضرت دل کی سوانح عمری یلدرم کی قوت متخیلہ کی بے پناہ انفرادیت کا نمونہ ہے۔ دل بچپن سے جوانی تک کے احساس کا ذکر کرتا ہے۔ یلدرم مختلف موضوعات پر اپنی رائے دینا چاہتے تھے۔ ایک مضمون لکھ کر بھی اپنی مقصد پورا کر سکتے تھے۔ لیکن خیال کو لطیف پیرائے میں ادا کرنے کی رجحان نے ایک نرالا اسلوب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس

تخلیق میں حسن کی تشریح کی گئی۔ اس کی حقیقت پر
روشنی ڈالی گئی۔ اس طرز سے جس قدر لطافت پیدا
ہو گئی ہو، دوسرے طرز میں ناممکن تھی۔ حسن کی بے
اعتنائی اور قدر ناشناسی کا شکوہ دیگر لوازمات کے
ساتھ شاعری میں نظر آتا ہے۔ یلدرم نے اپنی نثری
تحریر میں ایسی ہی شاعری کی ہے۔" (۲۷)

حکایۂ لیلیٰ و مجنوں

یلدرم کا یہ طبعزاد افسانہ تین قسطوں میں رسالہ ''مخزن'' میں اکتوبر 1907ء اپریل 1908ء اور مئی 1908ء میں شائع ہوا تھا۔

اس افسانہ میں روایتی لیلیٰ و مجنوں کے عشقیہ قصے کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ قیس کمرے میں نہایت غمگین حالت میں بیٹھا ہوا ہے اسے لیلیٰ کا پیغام وائرلیس پر ملتا ہے کہ وہ کل موٹر کار کے ذریعے سیر و تفریح کی غرض سے ایک ہفتہ کے لئے جائیگی۔ کیونکہ اس کے ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ جنگل کی خشک ہوا لیلیٰ کی صحت کے لئے مفید ہوگی۔ 1907ء کا قیس اپنے شہر نجد میں ریل، تار، موٹر کار، گراموفون اور دیگر ترقیاتی سہولتوں کا عادی تھا۔ رات کے ایک بجے کا وقت ہوتا ہے اور قیس بے چین ہے کہ کس طرح لیلیٰ کی کار کا پیچھا کیا جائے۔ وہ سوچتا ہے کس مشکل سے اس کے والد نے اسے بائیسکل خرید کر دی تھی اور اب ان کے لیے کار خریدنا آسان نہ ہوگا۔ جب کہ لیلیٰ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

علی الصبح قیس، لیلیٰ کا پیچھا کرنے کے لئے بائیسکل پر سوار گھر سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اسے سمت کا پتہ نہیں کہ کدھر جانا ہے۔ تبھی ایک ہوا کے جھونکے سے پٹرول کی بو آتی ہے اور قیس اسی سمت چل پڑتا ہے۔ تھکن و ناامیدی کی پرواہ کیے بنا قیس چلتا ہے راستے میں ایک جگہ سڑک کا کام چلتا ہے مجبوراً قیس پگڈنڈی پر چل دیتا ہے۔ تھوڑی دور جانے پر اس کی سائیکل کی گھنٹی خراب ہو جاتی ہے۔ بنا گھنٹی کے وہ سائیکل

نہیں چلا سکتا کیونکہ سڑک پر چھکڑے اور ہر قسم کے جانوروں کی قطاریں رہتی ہیں لہذا قیس مجنوں کا ایک ٹوکرا خرید کر ہینڈل پر رکھ لیتا ہے اور میلوں کا سفر طے کر لیتا ہے۔ اچانک خار مغیلاں اپنا کام کر دیتے ہیں۔ جب ان کی رسائی قیس کے تلوؤں تک نہیں ہوتی تو وہ سائیکل کے پہیوں پر اپنا ہاتھ صاف کر لیتے ہیں اور ٹائر میں سوراخ کر دیتے ہیں قیس کی کہنی اکھڑ جاتی ہے اور بائیسکل ٹوٹ جاتی ہے۔

قیس اپنے اقربا اور ڈاکٹروں کے مشورے پر ہندوستان اور دوسرے ممالک کی سیاحت کر چکا تھا۔ مگر بائیسکل کی چوٹ کی وجہ سے لیلیٰ کے تعاقب میں ناکامی اس کے مزاج میں وحشت بھر دیتی ہے اور علاج کی خاطر وہ ایک بار پھر ہندوستان آتا ہے اور دہلی کے سول ملٹری ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ یہاں وہ رسالہ "پانیر" پڑھتا ہے۔ جس میں فارسی کا ایک شعر درج تھا

دور مجنوں گزشت و نوبت ماست

ہر کسے پنج روز نوبت اوست

شعر پڑھ کر قیس کو بہت اذیت ہوتی ہے اور پھر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ وہی پرانا قیس ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہے۔ جس مجنوں کے زمانے کو ختم سمجھا جاتا ہے وہ بد نصیب اپنی زندگی پھر جینے پر مجبور ہے میں کس طرح سب کو یقین دلا دوں کہ میں وہی قیس ہوں۔ تبھی ایک چودہ سالہ لڑکا یہ شعر پڑھتے ہوئے جاتا ہے :

داستاں میری سنو قصہ مجنوں نہ سنو

وہ بھی کیا قصہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہ ہو

اب قیس کا غصہ بڑھ جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ جو کرب، مفارقت، صحرا نوردیاں، آہیں اور

نالے میں نے نجد میں کیے وہ فرضی تھے۔ اسی وقت ایک یکہ والا وہاں سے گاتے ہوئے گزرتا ہے:

ہم تو مریں گے یار کی دیوار تلے

مجنوں کو تھا جنوں جو بیابان میں رہ گیا

یہ الفاظ قیس کے خیالات کو دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں کہ میں ایسی خوش نصیبی کی توقع کہاں کر سکتا ہوں۔ یہاں یلدرم میونسپل انتظامیہ پر طنز کرتے ہیں ملاحظہ ہو

"ہم تو مرے گے یار کی دیوار تلے"۔ دیوار تلے بیٹھ کر دم توڑ دینا، شاید ہندوستان میں ممکن ہو تو ہو۔ متمدن میونسپلٹی ظالم، پابند قانون، میونسپلٹی والے نجد میں تو ممکن نہیں، صرف ایک طریقہ مرنے کا اور ہے لیکن وہ خود اختیاری نہیں، وہ دیوار کی عنایت پر منحصر ہے یعنی وہ جب یار کی دیوار کے تلے گزرتا ہو تو وہ (یعنی یار کی دیوار) لطفاً و مرحمتاً اس پر گر پڑے اور اس طرح وہ دیوار کے تلے دب کر مر جائے لیکن یہاں بھی وہی ظالم میونسپلٹی کا پاؤں اڑا ہوا ہے۔ اول تو اہل خانہ خدا کے فضل سے ہمیشہ مکان کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔ بالفرض وہ بھول بھی جائیں تو میونسپلٹی اگر کسی دیوار کو خطرہ کی حالت میں دیکھتی ہے تو وہ اسے گرا کے نئی اور مضبوط دیوار بنوا

دیتی ہے۔" (۴۸)

قیس دل پر لگے زخموں کی چبھن کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرام کرسی پر گر پڑتا ہے اور کچھ دیر میں تازہ دم ہو کر رسالہ "مخزن" پڑھنا شروع کرتا ہے کہ اس کی نظر نیرنگ کی ایک غزل کے مقطع پر پڑتی ہے

پھر ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ

ان کا عالم وہی، نیرنگ کا نقشہ ہی وہی

اتنا پڑھتے ہی قیس خوش ہو اٹھتا ہے اور اس کی طبیعت بشاش ہو جاتی ہے۔ وہ ٹینس کھیلنے نکل جاتا ہے۔ رات اس ہوٹل میں ایک جلسہ ہوتا ہے قیس یہاں تنہا بنا ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن اس کی نظر ایک ایسی لڑکی پر ہوتی ہے جس کی آنکھیں سیاہ اور بال نرم و سیاہ تھے اس کا چہرہ نہایت دلکش تھا۔ کچھ دیر میں تمام عورتیں و مرد پیانوں کے گرد جمع ہوتے ہیں لیکن وہ لڑکی قیس سے باتیں کرتی ہے اور سوالات کی بوچھاڑ کرتی ہے۔ اس کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے قیس پر جذبات کی شدت اپنا اثر کرتی ہے اور وہ صوفے پر سے گر پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگتے ہیں لیکن کچھ دیر میں وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دہلی سے لاہور جانے کے بعد قیس وہاں کے زولوجیکل گارڈن میں جا کر ہرنوں کے غول میں سے غزال عرب ہرنوں کی آنکھوں کو چومتا ہے۔ وہاں موجود ایک شخص اخبار میں سارے قصہ کو بیان کرتا ہے اور خلاصہ کرتا ہے کہ سیکڑوں برس بعد قیس نے اسی سرزمین پر دوبارہ جنم لیا ہے۔ قیس جب واپس آتا ہے تب وائرلیس پر لیلیٰ کا پیغام ملتا ہے جو دہلی سے ہوتا ہوا آتا ہے۔ وہ کہتی ہے اس عرصہ میں میری طبیعت اچھی

نہیں رہی نقاہت بھی ہے اور کل شب مجھے برقی بیٹری لگائی گئی کیونکہ میرے ہاتھوں میں بڑی اینٹھن تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب قیس دہلی میں صوفے سے گرا تھا۔

ہندوستان سے لوٹنے پر بھی قیس کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوتا ہے بلکہ قیس اخبار کے ذریعہ لیلیٰ کو پیغام بھیجتا ہے۔ اشتہار سے لیلیٰ کے خاندان والوں کی خوب بدنامی ہوتی ہے۔ وہ اخبار پر دعویٰ دائر کرنے کا سوچتے ہیں لیکن چند لوگ معاملہ سلجھا دیتے ہیں۔ قیس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے والد اسے مکّے لے آتے ہیں۔ اور کعبہ شریف کے سامنے پہنچ کر قیس سے کہتے ہیں کہ اپنی قابل رحم حالت سے نجات کے لئے دعا کرو۔ یہی اس افسانہ کا اختتام ہے۔ یہاں قیس وہ دعا کرتا ہے جو اس نے برسوں پہلے کی تھی۔

''میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں۔ خدا کرے وہ
کبھی ختم نہ ہو۔'' (۲۹)

مرکزی کردار قیس نئے دور کا ترجمان ہے۔ جو ہر نئی چیز سے واقفیت رکھتا ہے۔ صرف قیس ہی نہیں لیلیٰ بھی نئی ٹکنالوجی کو استعمال کرتی ہے۔ یلدرم کے یہ کردار اپنے دور کی موثر نمائندگی کرتے ہیں۔ یلدرم کے کرداروں کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :

''سجاد حیدر یلدرم کے طبع زاد افسانوں میں اکثر
حیات انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے اور ان کو
دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حیات و
جذبات انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ

حاصل ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک جزو
سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی
خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلسفہ گو دنیا کا
خشک ترین شغل بنا دیتا ہے۔ سجاد حیدر کے یہاں
بھی فطرت انسانی کا مطالعہ اس لطیف طرز پر ہوتا
ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی
ہے۔" (۳۰)

یلدرم نے قیس کے جذبات اور ہیجان کو اس خوبی سے تراشا ہے کہ یہ براہ راست قارئین کے دلوں پر چھا جاتا ہے۔

اس افسانہ کی زبان بہت سادہ ہے۔ لیکن یلدرم نے جہاں جہاں تشبیہوں سے کام لے کر اس میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ درج ذیل مثال پر غور کیجیے

"جن صحراؤں میں وہ غزالوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی
آنکھیں چوما کرتا تھا۔ کیونکہ وہ لیلیٰ کی آنکھوں
کے مشابہ تھیں ان صحراؤں میں اب وہ عفریت
جو آگ کھاتا ہے اور دھواں اگلتا ہے۔ پھنکاریں
مارتا ہوا اور بل کھاتا ہوا رات دن پھرتا تھا اور
ان بھولے لیلیٰ صفت غزالوں کو پریشان کیے
ہوئے تھا اور اب وہ مجنوں کے پاس آنا کیا
انسان کی صورت سے بھڑکتے تھے اور اس کی

کلفت بار رقیبوں کی شانوں سے بہ گئے پھرتے

تھے۔''(۳۱)

یلدرم نے اس افسانہ میں تضاد کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ جہاں انھوں نے آگ، پانی، رومان اور مزاح کو ایک ساتھ برتا ہے۔ وہیں ایک مشفقیہ حکایت کی کامیاب پیروڈی کی ہے۔ مثلاً لیلیٰ کا، ائرلیس پر پیغام دینا۔ لیلیٰ کی موٹر کی خبر ہوائی جھونکوں کے ذریعہ پہنچنا، کانٹوں کا (خار مغیلاں) کا ہاتھ پہل کے ربر میں سوراخ کرتا یا بطخوں کی ٹوکری کو بائیسکل کے ہینڈل کو باندھنا۔ ''حکایہ لیلیٰ و مجنوں'' کے لئے یلدرم نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں بے انتہا فن کارانہ حسن اور سادگی کو شامل ہے۔ یہ ایک روایتی قصہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی حقیقتوں سے اس میں کہیں گریز نہیں ملتا ہے۔

جس وقت یلدرم نے یہ افسانہ تحریر کیا اس وقت یہ موضوع کوئی نیا نہیں تھا لیکن یلدرم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس افسانے کو جس طرح بیسویں صدی کا منظر نامہ بنا کر پیش کیا اور اس میں جدت دکھائی اس وقت تک اردو نثر میں اس طرح کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی تھی۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں

''ہم نے لیلیٰ و مجنوں کے افسانے کو کئی بار پڑھا ہوگا
مگر سجاد حیدر یلدرم جب اس قصے کے قدیم چوکھٹے
میں نئی تہذیب کی تصویریں پہناتے اور ہمارے
سامنے پیش کرتے ہیں تو ہماری نظریں عجیب حیرت
واستعجاب سے اس پر پڑ جاتی ہیں۔ اور اختتام تک

غربت و وطن

افسانہ "غربت و وطن" رسالہ "اردوئے معلیٰ" میں جنوری 1907ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کا پلاٹ وطن سے دور ایک محب وطن کے جذبات کی پرسوز داستان پر بنا گیا ہے۔ آدھی رات کا وقت ہے اور اس افسانے کا کردار رشید اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھا وطن کو یاد کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں اور وہ غربت اور وطن کی محبت کا موازنہ کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

"غربت اچھی کہ نئی دنیا، نیا آسمان، نئے
مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ نہیں وطن اچھا کہ
پرانے دوست پرانے رفیق۔

جانی پہچانی آوازیں، جانی پہچانی صورتیں،
سنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔ نہیں غربت اچھی
جس میں ہر چہرہ نیا، ہر بات نئی، جو آدمی ملتے ہیں
گویا دو دریا ہیں کہ پہلے جدا جدا بہتے تھے، اب
سنگم ہوا۔

نہیں وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دو
پودے ہیں کہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے اگے
اور بڑھے۔

نہیں غربت اچھی، جہاں دوست نہ دشمن ور

دوست کا خط

''دوست کا خط'' یہ ایک مختصر تخلیق ہے۔ جس میں دوست کا خط پا کر مکتوب الیہ کے جذبات کی یلدرم نے نہایت کامیاب عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

''تو پیارے دوست کا خط ہے۔ تجھ میں وہ کون سی برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے، تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں؟ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں باعث تفاخر و تفوق یہی ہے نا کہ دوست نے تجھے لکھا۔ لب پان خوردہ سے اف، لب پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بے شک، بے شک، یہ بہت بڑا تفوق ہے۔'' (۳۳)

طرح طرح سے غور دینے کے بعد مکتوب الیہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دوست کا یہ خط امتحان سے بالاتر ہے۔ ہر طرح کے موازنے سے آزاد اور دوست کے اس پیارو سینے سے لگانا چاہیے اور اسے نظر اغیار سے بچا کر رکھا جانا چاہیے۔ وہ کہتا ہے میں تجھے محفوظ رکھوں گا اور ہزاروں مرتبہ تنہائی میں پڑھوں گا۔

اس افسانہ میں یلدرم نے مکتوب الیہ کے جذبات کو نہایت خوبی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر اہے جو دوست کا محبت نامہ پا کر جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس

افسانہ کو واحد متکلم کے ذریعے یلدرم نے بیان کیا ہے۔ جس کے جذبات سے وہ افسانے کی فضابندی کرتے ہیں جہاں انسان کی داخلی کیفیات کو انھوں نے نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اس کے احساسات، جذبات افسانے کی فضا میں شروع سے آخر تک قائم رہتے ہیں۔ افسانہ کی زبان نہایت سادہ ہے ساتھ ہی تشبیہات کا استعمال ناگوار نہیں گزرتا بلکہ اس سے زبان کی خوبی اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔ اس افسانہ کے لیے یلدرم نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

اگر میں صحرانشین ہوتا

یلدرم کا یہ افسانہ رسالہ "مخزن" میں دسمبر 1907ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں فردِ واحد اپنے باطنی تلاطم اور خارجی ماحول کے فکری سطح پر ٹکراؤ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر میں صحرانشین ہوتا تو طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہوتا ہے۔ چاندنی رات میں چاند اور تاروں کا خوبصورت منظر میری نظروں کے سامنے ہوتا۔ اندھیری رات میں سارے عالم کی تنہائی اور تاریکی مجھ پر اثر کرتی اور دل ان گہرے احساسات کو محسوس کرتا۔ اگر کسی وادی میں گڈریا ہوتا تو اس پر فضا گھاٹی کے پھول اور ان پھولوں کو دیکھ کر گانے والی بلبل اور وہاں کے آبشار و چشموں حیرت زدہ سا دیکھتا رہتا اور ایک پُرمسرت زندگی بسر کرتا۔ لیکن تبھی وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف لوٹ آتا ہے اور سوچتا ہے مگر میں شہر کی زندگی کی ان بُری سچائیوں کے ساتھ جینے پر مجبور ہوں جسے میں چاہ کر بھی نہیں بدل سکتا۔ جہاں ایک غریب لڑکا سڑک پر سے گزرتے ہوئے عالیشان عمارتوں کی کھڑکیوں کو گن کر اپنا وقت ضائع کرتا ہے اور پھر آگے بڑھ کر ایک مٹھائی کی دکان کے پاس حسرت سے منہ کھول کر مٹھائیوں کو تکتا ہے۔ یہاں چند ایسی لڑکیاں بھی ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے عصمت فروشی پر مجبور ہے۔ اسی ماحول میں چند ایسے افراد بھی ہیں جو شرابی ہیں اور چور اچکے ہیں یہ لوگ فلاکت و حاجت کے تحت چوری پر آمادہ ہے لیکن دوسروں کو عبرت کی خاطر ان کو سزا دی جاتی ہے۔ اس سماج میں وہ لوگ بھی ہیں جو فقیر کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر وہ روتا ہے، کڑھتا ہے اور کہتا ہے ملاحظہ فرمائیے

سیل زمانہ

یہ افسانہ یلدرم کا طبعزاد افسانہ ہے۔ جو رسالہ "مخزن" میں جون 1907ء میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا فانی ہے۔ زمانہ گزرتا جاتا ہے اور دنیا کی ہر چیز دھیرے دھیرے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ افسانہ کی شروعات اس طرح ہوتی ہے:

"بہے جا، بہے جا، نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے
سہارے سلامتی۔ مٹے ہوؤں کے نشان مٹاتے جا۔
تباہوں کو ڈبا، غواصوں کو نہ ابھار۔ یہی تیرا کام
ہے۔" (۳۶)

فرد واحد جتا ہے تجھ میں خوشنما سے بھی جزیرے ہیں۔ جن میں طرح طرح کے پھول اور پھل ہیں ان میں خوبصورت پرندے چہچہاتے ہیں۔ کیا یہی لذائذ حیات ہیں؟ یہاں حسین سحر کار عورتیں ہاتھ میں ستار لیے گاتی ہیں جو جوانی کی امنگیں پیدا کرتی ہیں لیکن مجھے پتہ ہے کہ مجھے ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی تو مجھے تباہ کر دے گا کیونکہ تو کسی کی نہیں سنتا۔ تب ان سوالوں کا جواب اسے اس طرح ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"یہ دنیا، کیا اور تیری کیا ہستی، بھنور میں پڑنا،
طوفان کا تھمنا موجوں کا مجھے تھپیڑے مارنا میرے
سوالوں کا جواب ہے؟ تجھے میرے سوالوں سے

غصہ آ گیا۔ میں نے بے ادبی کی؟ اچھا، اچھا جواب
نہ دے، بہے جا، بہائے جا۔" (۳۷)

وہ شہروں کی تباہی کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح بابل، نینوا، قدیم ہند اور قدیم مصر تباہ ہو گئے۔ اس کے بعد شخصیتوں کا ذکر آتا ہے کہ بڑی سے بڑی شخصیتوں نے بھی موت کا مزہ چکھا ہے۔ مثلاً سکندر، ہینبال، نوشیرواں اور دارا۔ یہاں وہ بتاتا ہے کہ سب دھوکا ہے، شہرت، نام ونمود اور خود زندگی دھوکا ہے۔ آخر میں فرد واحد اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور افسانہ کا خاتمہ ان کلمات پر ہوتا ہے

"اس لئے بہتر یہی ہے کہ بے تعداد خس و خاشاک کی
طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے
بہہ جاؤں۔
پس اے سیل زمانہ، بہے جا، بہائے جا اور
اس بحر ناپیدا کنارے میں اس عمان عظیم الشان
میں، اس اوقیانوس ابد میں اب یا جب تیرا دل
چاہے گرا دے۔" (۳۸)

افسانے کی زبان سادہ اور پر تاثیر ہے۔ یہاں یلدرم نے منفرد اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ یہ افسانہ زبان و بیان اور اسلوب کی وجہ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں انھوں نے شعور کی رو تکنیک کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں

"یلدرم کا سیل زمانہ" اور "اگر میں صحرا نشین ہوتا"

آج کے جدید افسانہ کی تعریف پر پورے اترتے
ہیں۔ ویسے تو کہانی ایک رومانی رویے کی حامل ہے
مگر فلسفہ زماں کے چند ایسے نکات اس میں چھپے
ہوئے ہیں جو جدید فلسفیانہ خیالات کی طرف
ہمارے ذہن کو متوجہ کرتے ہیں۔ اردو فکشن میں
''سیل زمانہ'' میں پیش کئے گئے وقت کے بصیرت
افروز شعور کو اگر کسی فکشن نگار نے غیر معمولی کامیابی
کے ساتھ برتا ہے تو خود یلدرم کی صاحبزادی قرۃ
العین ہیں۔''(۳۹)

مجموعی تاثر:

''خیالستان'' کے تمام افسانوں اور انشائیوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد جو سب سے پہلا تاثر ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ یلدرم نے جہاں فن کے تقاضوں کو اہمیت دی وہیں زندگی کے حقائق سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ ''خیالستان'' میں شامل سبھی تخلیقات چاہے وہ تراجم ہوں یا طبعزاد افسانے ہر ایک موضوع کے اعتبار سے جدا اور اچھوتا ہے۔ صنف افسانہ کے وجود میں آنے سے قبل یلدرم نے اپنے اس شاہکار مجموعہ میں ہر اس موتی کو پرو دیا جو آگے چل کر نئی پود کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ان میں صرف خیالوں کی دنیا ہی آباد نہیں بلکہ سماج و معاشرہ کی تلخ سچائی بھی شامل ہے۔ بھلے ہی اس میں کلاسیت جگہ پاتی ہے لیکن انسانی نفسیاتی کیفیت، ان کی

محرومی دراں کے شعور میں پیدا ہونے والی جنسی آزادی کی تمنا جیسے موضوع یلدرم کو دیگر ادیبوں میں ممتاز بناتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں

''ان کی تاریخی اہمیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کئی میدانوں میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ افسانے میں وہ پریم چند سے پہلے ہیں ''ادب لطیف'' کہی جانے والی نثر میں وہ نیاز فتح پوری پر مقدم ہیں اور مزاح میں ان کا اثر پطرس کے یہاں جا بجا نظر آتا ہے۔ انسانی نفسیات بھی کہانی کا موضوع بن سکتی ہے یا کہانی کے ذریعے انسانی نفسیات کے بعض گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے اس نکتے کی طرف بھی سب سے پہلے یلدرم ہی نے اشارہ کیا۔ پریم چند نے جب یہ کہا تھا کہ وہ اپنے افسانوں کے لیے ہمیشہ کسی نفسیاتی نقطہ عروج کی تلاش کرتے ہیں تو انھوں نے صاف لفظوں میں وہی بات کہی تھی جو یلدرم کی بعض تحریروں میں عملی طور پر نظر آتی ہے۔ اگر وہ باقاعدہ پلاٹ اور کردار بنانے پر قادر ہوتے تو اردو افسانے کی تاریخ میں پہلا اہم نام انھیں کا ہوتا۔ انھوں نے داستان اور افسانے کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کی اور اگر ایک

> طرف "گلستان"، "خارستان" اور "شیرازہ" جیسی داستان نما تحریریں لکھیں تو دوسری طرف "صحبت ناجنس"، "نکاحِ ثانی" اور "ازدواجِ محبت" جیسی تحریریں بھی لکھیں جنہیں افسانے کا نقشِ اولیں کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے دو مختلف طرح کی تحریریں لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ داستان اور افسانہ (یعنی Fiction) الگ الگ چیزیں ہیں۔" (۴۰)

یلدرم کا ماننا تھا کہ جذباتی، ذہنی اور نفسیاتی سطح سے پرے صحت مند معاشرے کی بنیاد اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عورت نہ جنسی نشاط اور مظلومیت و بے چارگی کا مرقعہ ہے۔ بلکہ وہ اپنی رفعت و کشش کو قائم رکھتے ہوئے معاشرے میں پھیلے ہوئے سارے مسائل کا سامنا کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا احساس دلاتی ہے۔

معاشرے کے عام معاملات میں یلدرم کا حصہ عام قائدین کے طرز سے بہت مختلف تھا مگر ان کے جذبات شدید، سچے اور نتیجہ خیز تھے۔ ہر تخلیقی آدمی کا رویہ عموماً دوری میں قربت کا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یلدرم کے تحریروں میں جہاں طنز اور مزاح کا رنگ ابھرتا ہے وہیں ان کی تہہ ملال اور حزن و فکر سے متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ سماج سے ان کا رابطہ ذہنی ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس کے باطن اور ظاہر دونوں میں تبدیلیاں لانا چاہتے تھے۔

وہ اُردو ادب کے پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے سامنے فن کا کوئی نمونہ موجود

نہ تھا۔ بلکہ ان کے افسانوں میں دورِ جدید کے ترقی یافتہ افسانوں کے نشان تلاش کرنا بے سود ہے۔ مگر ان کے افسانوں میں وحدتِ تاثر ضرور ہے جو مرکزی خیال سے جڑا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے افسانوں کے آغاز و انجام ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان کے کردار اپنی نفسیات اور ماحول کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ یلدرم کے کرداروں کے مکالمے ماحول اور مزاج سے پوری مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کے جملے مختصر الفاظ پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی نہایت پر اثر، برموقع و برمحل ہیں۔ چونکہ زبان و بیان پر یلدرم کی گرفت بہت مضبوط تھی لہذا انھوں نے اپنے کرداروں سے جو مکالمے کہلوائے ہیں انھیں اوسط سے بھی بڑھ کر درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اگر یلدرم کے افسانوں میں فنی نقطۂ نظر سے کچھ کمزوریاں پائی بھی جاتی ہیں تو اسے نظر انداز کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر صنفِ ادب اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کرتے وقت نامکمل ہوتی ہے۔

جس طرح مرزا غالب نے اپنی غزلوں میں مشکل الفاظ اور نئی نئی تراکیب استعمال کی ہے اسی طرح یلدرم نے بھی مشکل اور گراں ترکیب سے ایسے الفاظ کو اردو ادب میں شامل کیا ہے کہ ان مرکب الفاظ سے وسعتوں اور گہرائیوں کا ایک سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ مثلاً خندۂ جگر، حسنِ تضرع، ضربۂ بے وفائی، خندۂ ضیاء، سلسبیلِ قہر، فغانِ یاس، مضحکِ خوف، نوازش کار وغیرہ۔ یہی وہ انداز بیان ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی ان کی کامیاب تقلید نہ کر سکا۔ یلدرم کی تحریریں نہایت واضح، شگفتہ، پرزور اور دل چسپ ہوتی ہیں۔ اس میں بلا کی روانی جوش اور سلاست پائی جاتی ہے کہ قاری جب اسے پڑھنا شروع کرتا ہے تو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ ان کی بندشیں چست ہوتی ہیں۔

''خیالستان'' کے اوراق میں سجاد حیدر یلدرم نے اپنی قوت فکر اور رعنائی بیان کو اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ بلاشبہ اردو ادب میں ''خیالستان'' کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جس میں یلدرم کے فکری اور فنی جواہر پارے تا ابد مسکراتے رہیں گے۔

حواشی

۱۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ پروفیسر ثریا حسین ص 15

۲۔ غلام بھیک نیرنگ ''تمہید'' مشمولہ ''خیالستان'' سجاد حیدر یلدرم ص 28-27

۳۔ امتیاز علی تاج ''دیباچہ'' مشمولہ ''خیالستان'' سجاد حیدر یلدرم ص 31

۴۔ اردو نثر میں ادب لطیف از ڈاکٹر عبدالودود ص 117

۵۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 36

۶۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 56

۷۔ کہانی کے پانچ رنگ از شمیم حنفی ص 34

۸۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 42

۹۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ پروفیسر ثریا حسین ص 16

۱۰۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 90

۱۱۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 92

۱۲۔ افسانہ کی حمایت میں از شمس الرحمن فاروقی ص 193

۱۳۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 84

۱۴۔ خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 122

۱۵۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 128

۱۶۔اردو نثر میں ادب لطیف از ڈاکٹر عبدالودود ص 123

۱۷۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 160

۱۸۔قاضی عبدالغفار "سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص 51-52

۱۹۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 171-172

۲۰۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 175

۲۱۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 159

۲۲۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 70-71

۲۳۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 78-79

۲۴۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 58

۲۵۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 113

۲۶۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 100

۲۷۔اردو نثر میں ادب لطیف از ڈاکٹر عبدالودود ص 125-126

۲۸۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 140

۲۹۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 152

۳۰۔مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین ص

۳۱۔خیلستان از سجاد حیدر یلدرم ص 131-132

۳۲۔عبدالقادر سہروردی "فنی کارنامہ" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتبہ سید مبارز الدین

رفعت ص 106-107

۳۳۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 81

۳۴۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 153

۳۵۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 156

۳۶۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 157

۳۷۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 157

۳۸۔خیالستان از سجاد حیدر یلدرم ص 158

۳۹۔ابوالکلام قاسمی ''سجاد حیدر یلدرم'' مشمولہ ماہنامہ ''اوراق'' لاہور جلد 16 شمارہ 9،8 ستمبر، اکتوبر 1981ء

۴۰۔افسانے کی حمایت میں از شمس الرحمن فاروقی ص 185-186

☆☆☆

تھا۔ وہ ایک ایسا معیار قائم کرنا چاہتے تھے جس میں انتہا پسندی نہ ہو بلکہ جس سے سماج کی صورت حال بدل سکے۔ دیباچہ میں "التماس مترجم" کے عنوان سے لکھتے ہیں

"میری تمنا تھی کہ کس طرح ترکوں کے قصے ترجمہ
ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر
میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل
زندگی کی تصویر بھی اردو میں اس لئے ضرورت
سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں
جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا
ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشہ سے معلوم ہو
جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے اور
اب کہاں ہیں۔۔۔۔ مغربی معاشرت کے دلدادہ
تو اس قصے کو پڑھ کر شاید خوش ہوں گے مگر نفیس تو
یقیناً مکدر ہوں گے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے
کہ کیا کیا جائے زمانہ کا یہی رنگ ہندوستان پر چڑھ
رہا ہے۔ ترجمہ اکثر اکثر اور انوکھا معلوم ہوگا مگر
ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔
اور مغربی ایشیائی طرز تحریر کا کچھ ایسا اچھا امتزاج ہے
کہ میں نے لفظی ترجمہ کی کوشش کی ہے۔ گفتگو
انوکھی تو ضرور ہے لیکن سنئے تو

ہے۔ بظاہر عورت کو کمزور تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس میں جرأت بھی ہوتی ہے جسے یلدرم اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ضعیف اور دل ہی دل میں گھٹنے والی عورتیں بھی
جب ناچار ہوتی ہیں تو ان میں غیر معمولی جرأت پیدا
ہو جاتی ہے۔"(۳)

اس ناول کی زبان سادہ و سلیس ہے۔ خوبصورت تراکیب، عمدہ تشبیہات واستعارات سے سجا دلکش اسلوب اس ناول کو کامیاب ناولوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

"مطلوب حسیناں" اس ناول کا پلاٹ اس طرح بنا گیا ہے کہ مرکزی کردار پرتو بک کو دو عورتیں چاہتی ہیں۔ ایک مادام موزل لارانس اور دوسری مادام موزل بیٹرس۔ مادام موزل بیٹرس، پرتو بک اور مادام موزل لارانس کے تعلقات کو پسند نہیں کرتی ہے جس کی وجہ سے لارانس اور پرتو بک ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ لارانس سمجھتی ہے کہ پرتو بک بیٹرس کو چاہتا ہے اور پرتو بک خیال کرتا ہے کہ لارانس بیٹرس کو پسند کرتی ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ میڈم ہنریٹ سے لارانس اور پرتو بک دونوں کے تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ ان کی غلط فہمی کو دور کر دیتی ہے۔ ادھر لارانس کا باپ موسیو مشل اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیٹی کسی ترک سے شادی کرے لہذا وہ اس سے انکار کر دیتا ہے اور لارانس غم سے پاگل ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ ٹھیک ہو جاتی ہے تب اس کی شادی پرتو بک سے ہو جاتی ہے اور لارانس اور اس کا باپ مذہب تبدیل کر لیتے ہیں۔ موسیو مشل تبدیلی

مذہب کے بعد اپنا نام علی ابراہیم لکھ لیتا ہے اور لارانس صابرہ کہلاتی ہے۔

اس ناول میں ترکی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اور کرداروں کے نفسیات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ عورت کی محبت اس کا خلوص، اس کے جذبۂ رشک کا بیان، ساتھ ہی غم و غصہ کی تحر اور بے دلی کیفیات و ماں کی ممتا کا احساس، ناول میں عورت کی نفسیات کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ ناول کی زبان سادہ و عام فہم ہے۔ اسلوب نہایت شستہ و رواں ہے۔

ناول ''زہرا'' بھی ترکی ناول کا ترجمہ ہے اور مرکزی کردار زہرا ہے۔ زہرا کے بھائی اور بھابھی کے انتقال کے بعد عثمان بک زہرا کی پرورش کرتا ہے۔ اس کی بیوی بھی زہرا سے بہت محبت کرتی ہے اور اس کا ہر طرح خیال رکھتی ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد عثمان بک اپنے بیٹے رضا سے زہرا کی شادی کر دیتا ہے۔ لیکن دل نواز، رضا کو چاہتی ہے اور زہرا کی زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ رقابت، غلط فہمی اور جلد بازی کی وجہ سے ناول ایک المیہ داستان بن گئی ہے۔ دل نواز ناول کے ایک کردار صبری کو بلا کر رضا پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ زہرا کا تعلق صبری سے ہے۔ دل نواز ایک خط بھی گراتی ہے اور صبری کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے سامی دیکھ لیتی ہے۔ دل نواز اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ سامی سے سارا ماجرا سن کر اور خط ملتے ہی رضا زہرا کو طلاق دے دیتا ہے۔ زہرا اپنی بچی دل نواز کے حوالے کر کے چلی جاتی ہے۔ رضا دوسری شادی کر لیتا ہے۔ لیکن زہرا اپنی بچی کے بغیر نہیں رہ پاتی اور مجبوراً خادمہ بن کر بچی کے ساتھ رہنے کے لیے آ جاتی ہے۔ رضا کی دوسری بیوی خانم کا طور طریقہ اچھا نہیں ہوتا ہے۔ دل نواز کو جب پتہ چلتا ہے زہرا خادمہ بن کر رہ رہی ہے تب اسے حد درجہ

ندامت ہوتی اور وہ ایک خط میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے کنویں میں گر کر خودکشی کر لیتی ہے۔ دوسرے دن اس مکان میں آگ لگ جاتی ہے جہاں زہرا رہتی ہے، رضا اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام ہوجاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح سے اسے بچا کر اس سے معافی مانگ لے گا۔ لیکن کمرے میں دھواں بھر جاتا ہے اور دونوں کا دم گھٹ جاتا ہے۔

زہرا اور دلنواز کے کردار کو اس ناول میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس ناول میں منظر نگاری و جذبات نگاری بہت بہترین انداز میں کی گئی ہے کہیں پر بھی ترجمہ کا گمان نہیں گزرتا۔ ناول کی زبان سادہ و سلیس، رواں اور چست ہے۔ درج ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

> "دلنواز اس وقت اس مقام کے قریب کھڑی ہے
> جہاں رضا نے زہرا سے باغ میں اعتراف عشق کیا
> تھا اور وہ کھڑکی بھی سامنے ہے جہاں عثمان بیگ نے
> ان دونوں سودازدوں کو اعتراف عشق کرتے سنا
> تھا۔ دل نواز کی نظر ان دونوں مقامات پر پڑی اور
> پھر اس نے کئی مرتبہ اس کمرے کی طرف بھی دیکھا
> جہاں اس وقت زہرا سو رہی تھی اور اس کمرے کی
> طرف جہاں رضا اور نئی خانم سو رہے تھے۔ دونوں
> کمروں میں بالکل اندھیرا تھا۔" (۴)

اس میں نہ تشبیہات ہے اور نہ استعارے بلکہ سادہ جملوں میں نہایت معنی

ترجمہ میں کہانی کی تلخیص کی گئی ہے۔

یلدرم کا ناول "آسیب الفت" ماہنامہ نیرنگ خیال میں 1929ء اور مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں 1930ء میں شائع ہوا۔ اس ناول سے متعلق پروفیسر ثریا حسین کا یہ مفصل اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "آسیب الفت (1929ء) پر مصنف کا نام درج نہیں مختصر پیش لفظ میں بھی یلدرم نے اصل مصنف کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جن لوگوں نے ترکی زبان میں اصل افسانہ نہیں پڑھا ان کے لئے یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ یہ کس حد تک تخلیقی ترجمہ ہے اور کس حد تک گلستان و خارستان وغیرہ کی طرح یلدرم نے اس میں بقول خود بہت کچھ تصرف کیا ہے۔ "بیسویں صدی" کے تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دبستان ثروت وفنون کے کسی ادیب کی تصنیف بھی نہیں، شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے کتب خانے میں باوجود تلاش بسیار اس پلاٹ کے کسی ناولٹ یا اس کے مصنف کا کچھ اتہ پتہ نہ مل سکا۔ آسیب الفت بظاہر ایک گوتھک رومانس ہے لیکن درحقیقت ایک تمثیلی، علامتی ناولٹ ہے ایک سطح پر جس کا تعلق ابنارمل نفسیات اور ماو

رائج نفسیات سے ہے۔ آسیب الفت بلحاظ تکنیک
بھی قابل ذکر اور تیسری دہائی میں لکھے جانے
والے اردو فکشن سے مختلف ہے۔"(۵)

"آسیب الفت" اس ناول کا پلاٹ مرکزی کردار حسینہ کے اطراف بنا گیا ہے۔ جو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کا شوہر بھی اس پر جان نثار کرتا ہے۔ دونوں شہر سے دور گاؤں میں اس لئے آباد ہو جاتے ہیں کہ ان کی محبت پاکیزہ ہو اور دنیا کی حاسد نظروں سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن شیطان جو اول دن سے آدم کا دشمن ہے اس کی نظریں اس جوڑے پر پڑ جاتی ہے۔ وہ حسینہ کو مسلسل پریشان کرتا ہے۔ جس کے سبب وہ ایک نفسیاتی مریض بن جاتی ہے اور اپنے شوہر کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اس کی بے چین روح ہر رات کوٹھی میں پھرتی ہے۔ ان کا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے کوٹھی حسینہ کے شوہر کے چچا زاد بھائی ندیم کے ورثے میں آ جاتی ہے۔

ندیم جب اس کوٹھی میں آتا ہے تو حسینہ کی تصویر دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت حسینہ کے متعلق ہی سوچتا رہتا ہے اور اس کی بیتی زندگی کے بارے میں جاننے کا تجسس اسے چین نہیں لینے دیتا۔ گاؤں والے اور حسینہ کے نوکر اسے بتاتے ہیں کہ جس رات اس کے شوہر کا انتقال ہوا تب سے حسینہ لاپتہ ہے۔ اس کی لاش تو نہیں ملی مگر اس کی شال ندی کنارے پائی گئی اور تب سے اس کی روح اس کوٹھی میں پھرتی رہتی ہے۔ گاؤں کی یہ سب باتیں ندیم کو راس نہیں آتیں اور وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ معیادی بخار کے زیر اثر اس کا ذہن اسے وہی دکھاتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کی ملاقات حسینہ کی روح سے ہوتی ہے اور وہ اپنی زندگی کی تمام واقعات

ندیم کو سناتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح ایک بوڑھی عورت کے فریب میں آکر اس نے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود بھی ندی میں کود کر جان دے دی۔

اس ناول کا مرکزی کردار حسینہ ہے۔ جس کے اطراف کہانی کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ چونکہ ایک آسیب زدہ روح کا قصہ ہے اس لیے اس میں منظر کی خوبصورتی اور آسیب اور روح کے تحیر آمیز مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ اس ناول کی زبان سادہ وسلیس ہے۔ اشاروں و کنایوں میں یلدرم نے جذبات انسانی کی نفسیات کی گرہیں کھولی ہیں۔ یلدرم نے انسان کے دماغ کی قوت کو پیش کیا ہے کہ وہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ اپنے طور پر ایک خیالی دنیا آباد کر لیتا ہے جس میں انسان کی دوسرے کردار کو چلتے پھرتے بات کرتا ہوا دیکھتا ہے۔ بھوت پریت کے واقعات انسان آئے دن سنتا رہتا ہے اور اس کے متعلق واقعات گڑھتا بھی ہے۔

کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جگہ یا گھر وغیرہ کو بدنام کر کے اس کی آڑ میں غیر قانونی کام بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسانی دماغ کی اختراع ہے جس کی بنیاد پر وہ بے مثال قصہ وکہانی بنا لیتا ہے اور یہی سب ندیم کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں یلدرم نے نیکی اور بدی کی جنگ کو پیش کیا ہے کہ بدی کن کن صورتوں نیکی پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ اور انسان کو اس کی قوت سے آگہی دلانا تھا کہ آج سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

ناول "ہما خانم" فارسی کے مشہور ادیب میر محمد حجازی کے ناول کا ترجمہ ہے۔ یہ ناول 252 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور نیرنگ خیال میں 1931ء میں شائع ہوئی بعد میں ادارۂ ادب اردو حیدرآباد دکن نے اسے 1932ء میں شائع کیا۔ ہما خانم ایک

عورت کی داستان ہے جو عورتوں کی تعلیم ان کی فلاح و بہبود میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ ہما کے والد کے انتقال کے بعد ان کے دوست حسن علی خان نے اس کی اور اس کی والدہ کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ حسن علی خان کی بیوی رقیہ اچھی بیوی ثابت نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود حسن علی خان اسے نہیں چھوڑتا۔ ہما خانم کی پرورش میں حسن علی خان نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

رفتہ رفتہ حسن علی خان، ہما خانم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ہما جب اسے بتاتی ہے کہ وہ منوچہر نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے تب وہ منوچہر کی پوری چھان بین کر کے اس رشتے کو منظوری دے دیتا ہے۔ حسن علی خان حکومت ایران کے وزارت مالیہ کی مینی تخفیف اخراجات کا پریسیڈنٹ مقرر ہو کر قزوین چلا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے منوچہر اپنی والدہ کو اصفہان سے طہران بلاتا ہے اس کی والدہ جب ہما سے ملتی ہے تو وہ ہما کو بتاتی ہے کہ مدتوں سے منوچہر کی شادی آٹھ سال پہلے ہو چکی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔ ہما خانم اس رشتے سے انکار کر دیتی ہے۔

منوچہر کے دل میں کینہ آ جاتا ہے۔ وہ اور شیخ حسین ایک خطرناک ترکیب بناتے ہیں۔ یہ وہی شیخ حسین ہے جس نے پہلے بھی حسن علی خان کے خلاف اخبار میں مضامین چھپنے میں منوچہر کی مددگاری تھی۔ شیخ حسین روسی فوج کا مخبر بن جاتا ہے اور کہتا ہے کہ حسن علی خان انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور یہاں سیاسی انجمن قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روسی فوج حسن علی خان کو گرفتار کر لیتی ہے۔ حسن علی خان، شیخ حسین سے کہتا ہے ہما خانم کی ذمہ داری اب آپ پر ہے۔ منوچہر کو جب حقیقت پتہ چلتی ہے کہ حسن علی خان بے قصور تھا اور اس نے اس کے ساتھ غلط کیا تب وہ شیخ کی

خوشامد کرتا ہے کہ اسے رہائی دلادے لیکن شیخ کی نیت ہما کے لئے خراب ہو جاتی ہے اور وہ منوچہر کو بھی روسی فوج کے حوالے کر دیتا ہے۔ ادھر شیخ حسین دھوکے سے ہما اور اس کی ماں طلعت خانم کو اپنے گھر لاتا ہے اور اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ ہما روسی قونصل خانے پہنچ جاتی ہے اور جنرل کو ساری باتیں بتا دیتی ہے جنرل شیخ کو حراست میں لے لیتا ہے۔

پولوف حکومت سے غداری کرتا ہے اور پھانسی کا وقت ٹال دیتا ہے جس کی وجہ سے بے قصور حسن علی کی جان بچ جاتی ہے۔ ادھر جنرل کو تار ملتا ہے کہ حسن علی کی پھانسی کو رد کیا جا چکا ہے۔ حکومت سے غداری کے سبب پولوف کو عہدے سے برطرف کیا جاتا ہے۔ حسن علی خان چھوٹ جاتا ہے۔ جنرل منوچہر کے کیس کی بھی تفتیش کرتا ہے اور اسے بھی چھوڑ دیتا ہے۔ حسن علی خان اور ہما کی شادی ہو جاتی ہے اور پولوف ایرانی شہری بن جاتا ہے اور اپنا نام "شریف مردوان" رکھ لیتا ہے ایرانی فوج میں اسے وہی رتبہ دیا جاتا ہے جو اسے روسی فوج میں حاصل تھا۔

ناول "ہما خانم" کے مرکزی کردار ہما خانم اور حسن علی خان ہے۔ جن کے اطراف اس کہانی کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ ہما خانم اور حسن علی خان اس ناول کے مضبوط کردار ہیں۔ ہما خانم ایک ایسا کردار ہے جو تعلیم نسواں کی حامی ہے۔ حسن علی خان نے ہما کی پرورش کی اور وہ اس سے 15 سال بڑا ہے اس کے والد کا دوست ہے اور ہما سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ہما کی خوشی کی خاطر وہ اپنی محبت کا گلہ گھونٹ دیتا ہے اور اس کی شادی منوچہر سے کرانے تیار ہو جاتا ہے۔ منوچہر اس ناول کا منفی کردار ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ حسن علی خان بھی ہما کو چاہتا ہے تب وہ اس کے بدلہ لینے کی خاطر

اخبارات میں اس کے خلاف مضامین شائع کرواتا ہے۔ ہما شادی سے انکار کر دیتی ہے تو انتقام لینے کی خاطر حسن علی خان کے خلاف سازش کر کے اسے روسی فوج کی قید میں ڈلوا دیتا ہے۔ زیر بحث ناول روایتی ناولوں کی طرح مکالمہ نگاری کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ ناول کی زبان سادہ و عام فہم ہے۔ اسلوب کی دلکشی قابل تعریف ہے کہ قاری کو کسی پل بھی ترجمہ کا گمان نہیں گزرتا۔ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا یہ ناول عورتوں کو خود مختار بنانے کا درس دیتا ہے۔

یلدرم نے بھلے ہی ترکی ادب سے چند ناولوں کا ترجمہ کیا ہو لیکن جن موضوعات کا انھوں نے انتخاب کیا ہے وہ اچھوتے ہیں۔ ان کے کردار اپنے ماحول کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ ان ترجموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی ترجمہ نگاری کا گمان نہیں گزرتا اور نہ ان میں موضوع کے لحاظ سے یکسانیت نظر آتی ہے۔ یلدرم اپنے اسلوب اور زبان و بیان کی خوبیوں کی وجہ سے اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو زبان و بیان پر گرفت حاصل تھی۔ ان کے عمیق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے نے ان کو زبان پر عبور کامل دیا تھا جس کی بنا پر ان ترجمہ شدہ ناولوں میں ان کا انداز بیان بہت پر تاثر محسوس ہوتا ہے۔ ان ناولوں کو خوبصورت بنانے کے لئے یلدرم نے کہیں کہیں صنائع، تمثیل اور استعاروں کا سہارا بھی لیا ہے۔ خاص طور سے یہاں میں ان کے ناول ''آسیب الفت'' کے متعلق کہنا چاہتی ہوں کہ اس ناول کا موضوع انوکھا اور نرالا ہے۔ آسیب اور ارواح کے متعلق عام لوگوں کے جو نظریے ہوتے ہیں اور عوام جس غلط فہمی کا شکار ہوتی ہے اس کی قلعی یلدرم نے بہت خوبصورتی سے کھولی ہے۔

یلدرم کی ڈرامہ نگاری

اردو نثر کی یہ خوش نصیبی رہی کہ اسے پروان چڑھانے میں ایک سے ایک عظیم شخصیت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو ڈرامہ ایک طویل عرصے تک منظوم لکھا گیا آہستہ آہستہ نثر نے ڈرامے میں قدم رنجہ کیے۔ لیکن یہ صرف ناٹک ہی تک محدود تھے۔ پارسی کمپنیوں نے انھیں فروغ دیا اور دھیرے دھیرے اس میں ادبیت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ چونکہ اسلام میں کسی کی نقل کی ممانعت ہے۔ اس لیے اردو ڈرامہ بہت سست رفتاری سے اپنے ارتقاء کے مراحل طے کرتا رہا۔ اس میں ترجموں سے کام لیا گیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر ہم اردو ڈراموں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں بہت کم تخلیقات ایسی ملتی ہیں جو طبعزاد ہیں۔

یلدرم نے بھی ترکی ادب سے چند ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ جن میں جلال الدین خوارزم شاہ، پرانا خواب، جنگ و جدال اور طارق ہیں۔ ان کے سبھی ڈراموں میں جس ڈرامے نے زیادہ شہرت حاصل کی وہ "جلال الدین خوارزم شاہ" ہے۔

ڈرامہ **"جلال الدین خوارزم شاہ"** رسالہ "کہکشاں" لاہور میں ستمبر 1918ء سے مارچ 1920ء تک شائع ہوا۔ کتابی شکل میں یہ ڈرامہ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے 25 ستمبر 1925ء میں اس وقت شائع ہوا جب یلدرم مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ یہ ڈرامہ ترکی ادب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ جو نامق کمال بے کی تخلیق ہے۔ نامق کمال اپنے زمانے کے انقلابی اور ترقی پسند ادیبوں میں سب سے اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ انھوں نے یہ ڈرامہ 1875ء میں اس وقت لکھا جب

طاقتور روس انحطاط پذیر دولت عثمانیہ کے صوبہ جات پر قبضہ کر رہا تھا۔ انیسویں صدی میں مشرقی ترکی کی جو حالت زار تھی اس میں اور سات سو سال قبل عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس المیہ ڈرامے نے ترکوں میں وطن پرستی کی نئی روح پھونکی اور مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کو نیا حوصلہ دیا تھا۔ ڈرامے کے دیباچے میں یلدرم لکھتے ہیں :

> "نامق کمال بک ترکی ادبیات جدیدہ کے زندہ جاوید بانیوں میں سے ہے۔۔۔۔۔ وہ ہے جس کے حیات آفرین قلم پر بہ قول پروفیسر براون وطن کے عام لفظ کو محض زاد و بوم کے مفہوم سے بلند تر کے عشق ملک و ملت اور دین و مذہب کا حامل کر دیا۔ میں اس ڈرامہ سے جتنا متاثر ہوا ہوں اگر اس کا عشر عشیر اثر بھی ناظرین کے دل میں پیدا کر سکتا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہوگی۔" (۲)

261 صفحات پر چھپے ہوئے اس ڈرامہ میں عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملے اور مسلمان حکمرانوں کے باہمی نفاق سے پیدا کردہ حالات سے اس ڈرامے کا خمیر گوندھا گیا ہے۔ ڈرامے کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ علاءالدین خوارزم جس نے اپنی تمام عمر اور بائیس سالہ بادشاہت میں چالیس پچاس لڑائیاں لڑی تھیں۔ جن کی شہرت کا خود چنگیز بھی شیدائی تھا اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایک ایسے ویران جزیرے پر آ کر آباد ہو گیا ہے۔ جہاں کا پتہ سوائے اس کے چند وفاداروں کے اور کسی

میرے جیتے وجود باقی تھے۔ یہ بھی تیری راہ میں
قربان ہوں۔" (۷)

منظر بدلتا ہے۔ تبریز کے ایک محل میں حاملہ تمیز مہر جہاں جس کے محل کا محاصرہ جلال نے کرلیا تھا۔ اپنی کمزکی سے جلال کو دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتی ہے اور اپنا رشتہ بھیجتی ہے۔ جلال الدین کا مزاج جنگ میں صلح رکھی کا ہوتا ہے اس سے وہ یہ درخواست قبول کرلیتا ہے اور مہر جہاں سے نکاح کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد جلال الدین، مہر جہاں سے ملاقات کرتا ہے تو مہر جہاں کو دیکھ کر حیرت زدہ سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ کیونکہ مہر جہاں ہو بہو غزہ ون ہ شابہ ہوتی ہے۔

اپنے وفاداروں میں سے جلال الدین، نورالدین کو دیگر مسلم ممالک کے حکمراں کے پاس بھیجتا ہے کہ ہم سب متحد ہو کر تاتاریوں کے خلاف لڑیں گے لیکن ساری حکومتیں اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کہیں شیعہ وسنی کا مسئلہ تو کوئی یہ کہتا ہے کہ جلال اپنی حکومت وسیع کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بحث چلتی ہی رہتی ہے کہ ایک سپاہی داخل ہوتا ہے اور ایک خط لاتا ہے۔ نورالدین یہ خط پڑھتا ہے جو جلال کے ایک وفادار بیت اللہ قزوینی نے لکھا ہے ملاحظہ ہو

"جب میں شام میں تھا وہاں جن اشراف و امراء
سے ملاقات ہوئی ان کا خیال پایا کہ جب تک
دولت خوارزم شاہ بالکل نیست و نابود نہ کردی جائے
باقی حکومت کو آرام نصیب نہ ہوگا۔ اس غرض کے
لئے آپس میں متحد ہونے کے علاوہ انہوں نے

آتی ہے اطمینان رکھ ایسا ہی ہوگا۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور موت کی آغوش میں چلا
جاتا ہے۔ مہر جہاں، جلال کی وصیت کو فوج کے حوالے کر کے چاقو اپنے سینے میں تین
چار بار گھسا کر محبت کی راہ میں شہید ہو جاتی ہے۔

ڈرامے میں کل چوبیس کردار ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار جلال الدین
ہے۔ جو اسلام کی بقا اور تاتاریوں کے مظالم کے خلاف مرتے دم تک لڑتا ہے۔ وہ
چاہتا ہے کہ چنگیز کے ظلم و جبر اور بربریت سے مسلمانوں کو نجات دلائے یہ کردار بہت
سنجیدہ ہے۔ لیکن اس کی زندگی کا خاتمہ ایک مسلمان ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ جلال
الدین کی طرح اس کے امراء میں ملک نصرت، نور الدین، اور خان ارواز بیگ جیسے
کردار بھی بہادر ہیں اور تاتاریوں کے خلاف ہر جنگ میں جلال الدین کا ساتھ دیتے
ہیں۔

اس ڈرامے کے نسوانی کردار بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں خاص طور سے
نجمہ کا کردار۔ نجمہ اپنے شوہر جلال الدین سے بہت محبت کرتی ہے اس کے ماتھے کی
ایک شکن بھی اسے برداشت نہیں ہوتی۔ جب جنگ در پیش ہوتی ہے تب وہ اپنے شوہر
کا ساتھ قدم قدم پر دیتی ہے۔ اس ڈرامے کے مکالمے بھی چھوٹے ہیں۔ ان
مکالموں میں ڈرامیت بھی ہے اور یہ مکالمے پر اثر ہیں۔ درج ذیل مکالمے ملاحظہ ہو

"[illegible]: (اپنے چہرے سے نقاب اٹھا کر) [illegible]

[illegible] (اس کے پاس جا کر) تم

یہاں کیا کر رہے ہو۔

جلال الدین [illegible] تو [illegible] ہے۔

جابر: میرا کچھ کام نہیں۔ مگر چونکہ میں آپ سے واقف ہوں اس لئے عرض کرتا ہوں، کیا آپ ہمارے بادشاہ نہیں ہیں۔

جلال الدین: ہاں میں تمھارا بادشاہ ہوں۔ تمہا تمھارا نہیں ساری دنیا کا بادشاہ ہو سکتا ہوں۔ میں نے کہ سچائی کا بادشاہ ہوں، میں نے چونکہ سچائی کی خدمت کی ہے لازم تھا کہ دنیا مجھے بادشاہ کہتی۔

جابر: اگر آپ سچائی کے بادشاہ تھے تو دشمن کے سامنے سے کیوں بھاگے۔ یہ درویشوں کا بانا کیوں پہن رکھا ہے۔ کیا آپ موت سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اہل دین کو تاتاریوں کے پنجے میں چھوڑ کر تمھاری مدد کرنے والے تمھیں کہاں پائیں گے۔ فقیروں کے بانے میں سنسان جنگلوں میں۔۔

جلال الدین: (بات کاٹ کر) خبیث! ادب سے بات کر میں وہ ہوں کہ میں نے دنیا کی تین سمتوں میں ہر جگہ علیحدہ علیحدہ ایک سلطنت قائم کی۔ عراق، عرب میں زمانہ بنی امیہ میں جو غلغلہ مشہور تھا، وہ آل عباس کے عہد میں اعراق عجم میں منتقل ہو گیا۔ عراق کے تمام افسروں اور عاملوں نے مجھ سے بے وفائی

کی وہ سلطنت جسے میں نے تیسری دفعہ قائم کیا تھا وہ
بھی میرے ہاتھ سے گئی مگر اب میں ایک چوتھی
سلطنت قائم کرنے کے لئے یہاں آرہا ہوں۔ تجھ
جیسے نے کیا سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے درویشی لباس
کیوں پہنا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں ایک
اور سلطنت قائم کروں گا اور تم جیسے مسلمان مرتدوں
سے جنہوں نے اپنی عورتیں، اپنے بچے تاتاری
مشرکوں کے سپرد کر دیئے ان سے جنگ کروں گا اور
شہید ہوں گا۔

جابر (جلال جس وقت عالم جذب میں کہہ رہا تھا
جابر آہستہ آہستہ اس کے پاس آتا ہے جلدی سے
اپنی کمر سے ایک خنجر نکال کر جلال کے سینہ میں
بھونک دیتا ہے) جنگ کر اور موت کے پنجہ سے
اپنے تئیں چھڑا سکتا ہے تو جتنی چاہے جنگ کر (۹)

اس ڈرامے کا پلاٹ اکہرا اور سادہ ہے۔ جس میں ایک واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ واقعات ایک کے بعد ایک فطری انداز میں رونما ہوتے رہتے ہیں ساتھ ہی ان میں ربط و تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔ یلدرم نے مکالموں کو بڑے اعتدال سے برتا ہے۔ ان میں نہ اتنی طوالت ہے کہ قاری پر بار گزرے اور نہ ہی اتنے مختصر کہ کرداروں کی شخصیت نمایاں نہ ہو سکے۔ اس ڈرامے کے مکالمے اس طرح

کرداروں کی شخصیت کو اس طرح مکمل کرتے ہیں کہ کرداروں کی صفات اجاگر ہو جاتی ہے۔ ان کی نفسیات، جذبات، قلبی واردات، ذہنی کیفیات، عقائد، اور خارجی شخصیت کی عکاسی بھی انھوں نے نہایت خوبی سے کی ہے۔ ڈرامہ "جلال الدین خوارزم شاہ" کے مکالموں میں استعمال شدہ الفاظ کرداروں کے جذبوں کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہیں اور اپنے موقع و محل سے گہری مناسبت رکھتے ہیں۔ یہ مکالمے چست، رواں، برجستہ، سادہ، مختصر، موزوں الفاظ، کرداروں کی نفسیات، جذبات کے عکاس ہیں۔ اس ڈرامے میں زبان و بیان اور اسلوب کی شائستگی ڈرامے کو بہت کامیاب بناتے ہیں۔ یہ ڈرامہ مدراس یونیورسٹی کے بی۔اے کورس میں بھی شامل کیا گیا تھا۔

ڈرامہ "پرانا خواب" 1930ء میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے منظر عام پر آیا۔ ڈرامہ کا مرکزی کردار کمال بیگ کے اطراف اس کہانی کا پلاٹ بن گیا ہے۔ کمال بیگ کا دوست ضیا اس کی بہن معراج سے محبت کرتا ہے۔ کمال کی چچازاد بہن شگوفہ بچپن سے اس سے محبت کرتی ہے مگر کبھی اپنے عشق کا اظہار نہیں کرتی۔ کمال بیگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یورپ چلا جاتا ہے۔ اس کی واپسی تک شگوفہ کی شادی شریف سے ہو جاتی ہے۔ شریف آرمی میں معاون مرکز قومندان (یعنی ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس) ہے۔ نو سال کی شادی شدہ زندگی میں شریف اور شگوفہ قریب رہتے ہوئے بھی وہ پیار ایک دوسرے سے حاصل نہیں کر پاتے جو انھیں حاصل کرنا چاہیے تھا۔ شریف اپنی نوکری کو اولیت دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے شگوفہ چاہ کر بھی اپنے دل میں اس کے لیے جگہ نہ بنا پائی اور اس کا دل کمال بیگ کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔

کمال بیگ بروسہ میں نوکری کرتا ہے۔ ایک بار جب وہ گھر آتا ہے تب

اسے پتہ چلتا ہے کہ شگوفہ اس سے بچپن سے محبت کرتی تھی۔ کمال اس سے وعدہ لیتا ہے کہ وہ ایک بار اس سے ملنے کے لیے بروسہ آئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی شگوفہ اس سے وعدہ کر لیتی ہے۔ تبھی اچانک بہیہ دمعلا سے ملنے آتی ہے جو معلا کی چچی ہے اور جیل سے بھاگ آئی ہے۔ اس کے سر پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام ہوتا ہے۔

منظر بدلتا ہے شگوفہ بروسہ پہنچتی ہے۔ کمال بک اور شگوفہ کے درمیان جب یہ وقت آتا ہے کہ وہ اپنے دل کا حال ایک دوسرے کے سامنے کھول کر رکھیں کہ تبھی تحسین آفندی کپتان پولیس کے حکم سے کمال کے گھر آتا ہے۔ انھیں اطلاع ملی ہے کہ استنبول سے بھاگی ہوئی ایک قیدی کمال کے گھر پناہ گزیں ہے۔ اس کے لیے اس واہ اس عورت کو پولیس تھانہ چلنا ہوگا۔ کمال اس سے بحث کرتا ہے کہ وہ ایک شریف عورت ہے اور وہ اسے کسی قیمت پر یہاں سے نہیں لے جانے دے گا۔ وہ کہتا ہے چاہے اس کے لیے میری جان چلی جائے میں اس کو بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ شہر بھر میں یہ افواہ پھیل جاتی ہے اور کئی افراد اس کے گھر کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور پتھراو کرتے ہیں۔

شگوفہ کو جب یہ بات پتہ چلتی ہے تو وہ بھی بہت پریشان ہو جاتی ہے منظر بدلتا ہے۔ معین بک جو کمال کا دوست ہے آکر کمال سے سارے معاملات کی تفصیل پوچھتا ہے۔ کمال اسے بتاتا ہے یہ سب ایک غلط فہمی ہے میرے گھر جو عورت وہ کوئی مجرم نہیں۔ معین اس سے کہتا ہے کہ اس نے آنے سے پہلے شریف کو تار کر دیا ہے کہ وہ آکر اپنے رشتہ دار کے مسئلہ کو حل کرے۔ کمال یہ سن کر سر پیٹ لیتا ہے اور شگوفہ پریشان ہوا ٹھتی ہے۔ اس کا اعتبار کمال پر سے اٹھ جاتا ہے کمال اس کو یقین دلاتا ہے مگر شگوفہ پر

کمال کہیں یہ نا سمجھے کہ اگر میں اس کی بیوی ہوتی تب بھی یہی حرکت کرتی۔

ڈرامے میں موجود مرکزی کردار کمال ہے جو اپنی محبت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا اور اس کی خاطر موت کو گلے لگانے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر شگفتہ بدنام ہونے سے بچ جاتا ہے۔ ڈرامے کے آخر میں جب شگفتہ اس کے گھر سے جاتی ہے تب وہ جو جملے کہتا ہے اس سے ڈرامے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے ملاحظہ ہو

"ہم نے اس خواب کو، اس بچپن کے پرانے خواب کو حقیقت بنانا چاہا مگر اس کے معنی یہ تھے کہ وہ صاف و شفاف چشمہ جو ہمارے دلوں میں بچپن، شباب کی طراوت و شادابی سے پیدا ہوا تھا، ختم ہو جائے۔ اس خواب کا حقیقت میں تبدیل ہو جانا اس خواب کی موت ہوتی اور اس صاف یاسمین یعنی اس معصوم شگفتہ کا اخلاقی تنزل اتنا اندوہناک ہوتا کہ۔۔۔ مگر نہیں، خدا نے حسین چیزوں کی حفاظت کرنے کے لئے فطرت میں ایک قوت پیدا کر دی ہے۔ مجھے یہ بات اس وقت ثابت ہوئی، مجھ پر یہ راز اس وقت منکشف ہوا۔ جب کہ اس پتھر کے ٹکڑے نے تیرے گلابی ہونٹوں کو خون میں رنگ کے ایک ناجائز بوسے سے روکا۔۔۔ جس وقت تو اخلاقی گرنے کو تھی، فطرت نے، اس نازیبا احساس

کے ڈرامے بھلے ہی ترکی ادب سے ماخوذ ہیں لیکن طبعزاد معلوم ہوتے ہیں ڈرامہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور اسلوب کی خوبی انہیں دیگر ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔

یلدرم کی رپورتاژ نگاری

اردو ادب میں رپورتاژ نگاری کے موجد ہونے کا سہرا سجاد حیدر یلدرم کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے دو رپورتاژ بعنوان "سفر بغداد" اور "زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ" لکھے ہیں۔ آیئے اب ان کی رپورتاژ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔

سفر بغداد

"سفر بغداد" 1904ء میں علی گڑھ منتھلی میں شائع ہوا تھا۔ پروفیسر ثریا حسین لکھتی ہیں

> "رپورتاژ" ایک فرانسیسی لفظ ہے اور چند سال
> سے اردو میں مستعمل ہو چکا ہے۔ رپورتاژ میں
> رپورٹر بیرونی حقائق کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں
> اپنے ذاتی تاثرات بھی پیش کرتا ہے۔ جبکہ رپورٹ
> یا سفرنامہ محض حقائق پر مشتمل ہوتا ہے۔ چند سال قبل
> ایک اردو روزنامے میں شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی
> کے ڈاکٹر رفیق حسین نے لکھا تھا کہ کرشن چندر
> کے "پودے" کو اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے
> لیکن یلدرم کے "سفر بغداد" کو جو ۱۹۰۴ء میں شائع
> ہوا اردو کا اولین رپورتاژ کہنا زیادہ صحیح
> ہوگا۔ "زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ" (۱۹۱۱ء) یلدرم کا
> دوسرا رپورتاژ تھا۔" (۱۱)

کسی بھی رپورتاژ نگار کو چاہیے کہ وہ اپنی تخلیق میں آنکھوں دیکھا حال بیان کرے نہ کے سنے سنائے واقعات کو بیان کریں۔ لہذا یلدرم نے ''سفر بغداد'' میں انہی تمام واقعات کی تفصیل سنائی ہے جو انھیں درپیش آئے ہیں۔ اس رپورتاژ کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) کراچی تا بصرہ اور (۲) بصرہ تا بغداد۔

رپورٹنگ کے انداز میں لکھا گیا یلدرم کا یہ رپورتاژ بہت دلچسپ ہے اس میں انھوں رپورتاژ نگاری کے فن کو بہت خوبی برتا ہے انھوں نے اس کے لازم اجزا سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ کراچی سے بصرہ اور بصرہ سے بغداد کے سفر کے دوران وہاں کے عوام کی سرگرمیوں کا احاطہ بھی انھوں خوبصورتی سے کیا ہے۔

انھوں نے موسم کا حال، جہاز پر ہونے والی سرگرمیاں اور دجلہ و فرات کو دیکھ کر ان کے دلی جذبات کو بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ انگریزوں کی پالیسیوں پر دھیما طنز کرتے ہیں جو رپورتاژ نگاری کا ایک جزو ہے ملاحظہ فرمائیے

> ''یہاں بھی وہی قرنطینہ! ''گواہ'' پر برٹش سفارت
> کے ایک جج بڑا آنریبل رنھ پکٹ قسطنطنیہ سے بغداد
> تشریف لے جارہے تھے، جو جہاز ہندوستان سے
> آتا ہے، اس کے مسافروں پر بصرہ میں ایک نہ دو،
> دس دن کا قرنطینہ ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے
> یہ ترکیب کی گئی تھی کہ بغداد سے برٹش اسٹیم لانچ کا
> میٹ تمرہ سے اس میں سوار ہو کے بصرہ جائیں اور
> کہیں کہ میں تمرہ سے آرہا ہوں تو ان پر کوئی قرنطینہ

> نہ ہوگا لیکن وقت یہ آن پڑی کہ محمرہ کے قرنطینہ کے
> افسروں نے کہا کہ اگر یہاں اتریں گے تو پانچ دن
> قرنطینہ میں رہنا ہوگا، آخر کار یہ ہوا کہ اسی جہاز کے
> ساتھ ساتھ چلے اور جب ایرانی سرحد سے نکل گئے تو
> ایک خالی مقام دیکھ کر چپکے سے جہاز کھڑا کیا گیا اور
> ہم تو "کومیت" میں سوار ہو گئے، اور باقی ہمسفر
> یوں ہی حسرت سے دیکھتے رہے۔" (۱۲)

جہاز پر سوار ہونے کے بعد بغداد پہنچنے تک اور شہر بغداد کی سیر کرنے کا سارا منظر یلدرم اس طرح بیان کرتے ہیں قاری اس میں کھو جاتا ہے۔ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصہ ہے اس رپورتاژ میں یلدرم نے مسلمان، عیسائی اور یہودی وارمنی عوام کے لباس ان کے تجارت کے معاملے بھی پتہ بیان کیا ہے۔

بغداد پہنچ کر وہاں رہتے ہوئے ان ساری عمارتوں کا انہیں افسوس ہوتا ہے جو بغداد کی شہرت کا باعث تھے۔ یلدرم نے وہاں کے اسکولوں اور مدرسوں کا جائزہ لیا اور ساری تفصیل قاری کے سامنے پیش کی اس وقت بغداد میں کتنے اسکول ترک ہیں کتنے فرنچ کیتھولک کے اور کتنے امریکی مشنری کے۔ لیکن وہ اس بات سے بے حد خوش ہوتے ہیں کہ یہاں تعلیم نسواں کے لئے علیحدہ انتظام ہے۔ اس رپورتاژ میں یلدرم نے بغداد کے لوگوں کے رہن سہن کو بھی بیان کیا ہے ملاحظہ ہو

> "بغداد کے مکان سب پکے اور شاندار ہیں۔
> دجلہ کے دونوں کنارے قصر بہت خوبصورت اور نئی

وضع کے ہیں، سڑک سے مکانوں میں داخل ہوئیے
تو تعجب ہوتا ہے کہ مکانوں میں کیسی صفائی رکھی جاتی
ہے۔

یہاں عام طور پر لوگ مصارف زندگی پر زیادہ
خرچ کرتے ہیں، مکانات کے تمام کمرے الافرنگ
(یورپین وضع میں) سجے ہوتے ہیں، سلاملق یا
ڈرائنگ روم ست نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوتے
ہیں۔" (۱۳)

یلدرم نے اس رپورتاژ میں وہاں کے سیاسی حالات کو بھی مختصراً قاری کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہاں کی سیاست کس طرح چلتی ہے اور ینگ ٹرک پارٹی کا اس میں کیا رول ہے۔ اور بات میں بات پیدا کرتے ہوئے وہ اس بات کی طرف آتے ہیں کہ بغداد کی خاک میں کتنے عظیم بزرگ سوتے ہیں۔ مثلاً

امام موسیٰ کاظم وامام محمد تقی علیہم السلام!
شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ!
اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ!

ان بزرگوں کے مزاروں پر وہ جاتے ہیں اور ان کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں :

"تاہم میرے سب سے بہ دل پر اس امر کا اثر ہوتا
تھا کہ میں ان بزرگوں کی حضوری میں ہوں جو اپنے

> علم، اپنی فضیلت اور اپنے تقدس کی وجہ سے اسلام
> اور مسلمانوں کے لیے باعث فخر و سبب برکت
> تھے۔'' (۱۴)

دارالخلافہ بغداد کے شاہی محل، کتب خانہ، قصر خلد، مدرسہ نظامیہ وغیرہ کو یلدرم تلاش کرتے ہیں لیکن افسوس، وہ کھنڈرات اس وقت تک ختم ہو چکے ہیں۔ جس کا انہیں بہت افسوس ہوتا ہے اور وہ اپنے جذبات کا اظہار اس رپورتاژ کے آخر میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ جو قوم بغداد کو چھوڑ
> رہے، دہلی کی ایک شاہی جامع مسجد و قلعہ دہلی،
> تاج محل آگرہ جیسی عمارتیں ہندوستان جا کر بنائے۔
> کیا یہ مغلوں کی طرف سے تباہی بغداد کا کفارہ
> کفارہ تھا؟
>
> بہر حال اے بدبخت دہلی و آگرہ!
> تم پھر بھی خوش نصیب ہو کہ تمہاری بہت ساری
> عمارتیں قائم ہیں اور تمہارے کھنڈر ابھی غائب نہیں
> ہوئے مگر اے بغداد۔۔۔۔۔۔؟'' (۱۵)

یلدرم کا یہ رپورتاژ اردو ادب کا پہلا اور بہترین رپورتاژ ہے جس میں فن رپورتاژ نگاری کے تمام اجزاء کا یلدرم نے نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ اس رپورتاژ کو پڑھ کر قاری کے دل میں ایک امنگ پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اس مقدس شہر کو

ایک بار دیکھ آئے۔انھوں نے تمام واقعات اور حالات کو بہت ہی چابکدستی وہ فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

زیارت قاہرہ قسطنطنیہ

''زیارت قاہرہ وقسطنطنیہ'' یلدرم کا دوسرا رپورتاژ ہے۔ جو جولائی اگست 1911ء میں رسالہ ''تمدن'' (دہلی) سے شائع ہوا۔اس رپورتاژ کی شروعات یلدرم یوں کرتے ہیں

''مگر جب یاد آہی گیا تو چل اے دل چل نیتن

دھیرے دھیرے چل رے دیوانے ، دھیرے

دھیرے چل۔''(۱۶)

وہ قاری کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ بلادِ عثمانی کی طرف یہ میرا دوسرا سفر ہے اور میں اپنے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جہاز پر سوار ہونے سے قبل میں ان کا مہمان ہوا تھا۔اس دفعہ وہ بمبئی سے سفر کر رہے تھے۔یہ رپورتاژ تین حصوں میں تقسیم ہے۔پہلے حصہ میں جہاز پر ہونے والی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔جس میں وہ بتاتے ہیں جہاز پر سوار ہوئے آج کا دسواں دن ہے اور ان کا جہاز نہر سوئز میں داخل ہوا ہے۔یہاں پر چل رہی ریلوے لائن کا وہ ذکر کرتے ہیں کہ انھیں بڑی چوحتی ڈیک پر سے ٹرین کو چلتے ہوئے دیکھے۔یہ ٹرین چھوٹی پٹری پر چلتی تھی۔اس کے بعد وہ مصر کی زرخیز وشاداب زمین پر ہونے والی زراعت کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

دوسرے حصے میں وہ مصر کے پہلے شہر پورٹ سعید کا ذکر کرتے ہیں۔یہاں

سے گزر رہی تھیں گویا ریل جا رہی ہے۔ پھر گھوڑا
گاڑیاں اور اومنی بسیں اس کثرت سے ادھر ادھر جا
رہی تھیں کہ سڑک کی ایک جانب سے دوسری جانب
جانا دشوار تھا۔ اس پر آدمیوں کا ایک دریا تھا کہ اُمڈ
آتا تھا۔" (۱۹)

تیسرے حصہ میں وہ بازار مصر کا حال سناتے ہوئے یہاں کی ہوٹلوں اور کھانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مصر کے ماحول کا موازنہ ہندوستان کے ماحول سے کرتے ہیں۔ ہوٹل کے انتظامات، کھانا برتنے کا انداز اور یہاں کے لوگوں کا رہن سہن وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ مسلم صورت، لیکن بہ صورت مسلم ہے، یہ اور اس
کے آباؤ اجداد اسلام سے اسی قدر دور رہے ہیں
جس قدر رند بہ دیر۔ یہ حضرات نصرانی ہیں، اور
پکے متعصب دشمن اسلام نصرانی۔ انھیں اس پر فخر
ہے کہ ہمارا خاندان شیوع اسلام سے پہلے عیسائی تھا
اور اب تک عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں۔ نخل مبارک
اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا مگر قبطی بادیہ خشک ہی
رہا اور اب تو اس بادیہ سے وہ جھکڑ چل رہے ہیں۔
اس شدت کی باد سموم اٹھ رہی ہے کہ مصر کی مذہبی
شادابی معرض خطر میں ہے۔

مگر اخفائے حقیقت کا مجرم ہوں گا اگر میرے
اس قدر لکھنے سے آپ کے دل پر یہ اثر ہو کہ مصر کے
ہوٹلوں میں جو لوگ بیٹھے جو لوگ جام بکف نظر
آتے ہیں، وہ سب قطعی نصرانی ہیں۔
یہ سچ نہیں!
وہ سب قطعی نہیں۔ ان میں سے بعض قطعی ہیں
لیکن اکثر اور بیشتر مسلمان مصری ہیں یا کلمہ گو ہیں
شاید۔" (۳۰)

نوجوان مصری نسل کے طور طریقے پر بھی یلدرم نے بہت گہری نظر ڈالی ہے کہ وہ فیشن میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ انھوں نے انگریزی رہنے والوں کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ لوگ دن بھر یہ اعتکاف میں گزارتے ہیں اور شام ہوتے ہی بن سنور کر باہر نکل جاتے ہیں اور قاہرہ کی سڑکوں کے کنارے بنے ہوٹلوں میں کھانا کھا کر ساری رات موج مستی کرتے رہتے ہیں۔

یلدرم کا یہ رپورتاژ سادہ و سلیس الفاظ میں لکھا گیا بہترین رپورتاژ ہے۔ اس رپورتاژ کو پڑھ کر قاری خود کو اس ماحول کا ایک حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس رپورتاژ میں ان کا اسلوب بہت دلکش ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یلدرم نے نہ صرف اردو ادب میں رپورتاژ نگاری کا آغاز کیا بلکہ اپنے رپورتاژ میں انھوں نے موضوع کی مناسبت سے اس کے اجزاء کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے برتا اور اس فن کے ساتھ انصاف کیا۔

یلدرم کی خطوط نگاری

اُردو ادب میں خطوط نویسی کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ خطوط وہ آئینہ ہوتے ہیں جو انسان کے داخلی کیفیات کو ہو بہو پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے کئی سارے خطوط ضائع ہو چکے ہیں۔ چند ایک جو بچ گئے اسے ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر نے مجموعہ ''دامان باغبان'' میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں یلدرم کے کل 70 خطوط شامل ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

سجاد حیدر کا خط بنام شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی	9
سجاد حیدر کا خط بنام نذر سجاد حیدر	40
سجاد حیدر کا خط بنام جلیل احمد قدوائی	7
سجاد حیدر کا خط بنام خواجہ غلام السیدین	5
سجاد حیدر کا خط بنام قرۃ العین حیدر	3
سجاد حیدر کا خط بنام مصطفےٰ حیدر	1
سجاد حیدر کا خط بنام مظفر عمر	2
سجاد حیدر کا خط بنام شمس العلماء تاجور نجیب آبادی	1
سجاد حیدر کا خط بنام قاضی عبد الغفار	1
سجاد حیدر کا خط بنام جناب ڈیئر ایڈیٹر تماد	1

شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کے نام لکھے گئے سجاد حیدر یلدرم کے خطوط سے ہمیں ان کی اور نذر سجاد کی شادی کے سلسلے میں بھیجے گئے رشتہ کے متعلق معلومات

حاصل ہوتی ہے۔ یہ خط انھوں نے ڈیرہ دون اور مسوری سے لکھے ہیں۔ ان 9 خطوں میں وہ تمام حالات ہمیں ملتے ہیں کہ کس طرح وہ اور نذر سجاد حیدر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

سجاد حیدر نے جتنے خطوط نذر سجاد کے نام لکھے ہیں ان میں ان کے روز و شب کے تمام معاملات و مصروفیت، مہاراجہ آف محمود آباد کے یہاں کے تذکرے اور دوروں کا حال شامل ہے۔ بمبئی کے ہوٹل تاج سے 30 دسمبر 1915ء کو لکھے گئے خط کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیے جو بنام نذر سجاد حیدر ہے

> "میں نے چاہا کہ رات کو بیٹھ کر خط لکھوں مگر رات کے کھانے کے بعد کئی آدمی آ گئے۔ خواجہ عبدالمجید، وزیر حسن، اور ایک حیدر آبادی دوست مسٹر ... آ گئے۔ ہم لوگ برآمدے میں بیٹھے تھے اتنے میں چمکتی ہوئی روشنی ناپید ہو گئی۔ رات کے بارہ بجے تک ہم لوگوں سے شاعرانہ مذاق باتیں کرتی رہیں۔ ان کی باتوں سے بھی ان کے شاعرانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔
>
> آج سے لیگ کا سالانہ اجلاس شروع ہوگا۔ ایک بڑا واقعہ یہ ہوا کہ وزیر حسن اور راجہ صاحب محمود آباد کانگریس کے اجلاس میں گئے۔ میں بھی ساتھ

تھا۔اب میرا خیال ہے اسلامی اخبارات رابہ
صاحب پر پھر لے دے کریں گے۔" (۲۱)

یلدرم کے ان خطوط سے ہمیں ملک میں اس وقت چل رہی سیاست کی بھی پوری تاریخ ملتی ہے۔ جب بھی وہ سیاحت کی غرض سے بیرون ممالک جاتے تھے اس ملک کے متعلق اور سفر کے دوران گزرنے والے ہر ایک پل کا منظرنامہ اپنی بیوی سے بیان کرتے تھے۔ جن میں جہاز پر سوار لوگوں کے حالات درج ہوتے یا پھر اگر جہاز کہیں کسی جزیرے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تو وہاں کے حالات کی تفصیل وہ اپنے خط میں ضرور لکھتے تھے ملاحظہ کیجیے:

"ہوٹل میٹروپول۔نیپلز
یکم جون 24ء
کل POMPEJI دیکھا۔شہر کے کھنڈر موجود ہیں۔کمرے ان کے اندر خم شراب، گھڑے، رکابیاں، چراغ۔باہر سڑکیں بے حد عبرت ناک نظارہ تھا۔ VESUVIUS میں اب بھی دھواں نکل رہا ہے مگر اسی کے نیچے شہر نیپلز پھر انسانوں نے آباد کرلیا ہے۔اور اس میں بے خوف وخطر مصروف عیش وزر پرستی میں ہیں۔کل صبح دس بجے ROMA جائیں گے۔" (۲۲)

اس سفر کے دوران یلدرم نے جو کچھ بھی دیکھا اسے بہت سادہ الفاظ میں

گئے۔ روم میں انھوں نے قدیم مصوری، رومائے قدیم کے دیوتاؤں کے بت اور ذائس کے مشہور گرجے دیکھے۔ یہاں کا قبرستان بھی دیکھا جو یورپ بھر میں عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی سفر کے دوران وہ لندن بھی گئے تھے۔ اور یہاں کی نمائش کی بھی انھوں نے بہت تعریف کی۔ یہ سفر انھوں نے اس وقت کیا تھا جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر کا جس وقت رزلٹ آنے والا تھا وہ بڑے بے چین تھے کیونکہ ان دنوں وہ زیادہ تر دورے پر رہتے تھے لہذا جہاں جاتے وہاں کا پتہ دے دیتے کہ اس ایڈریس پر رزلٹ تار کر دو۔ ملاحظہ ہو:

"کلکتہ

29 مئی 41ء

پیاری نذر السلام علیکم

تم فوراً ذیل کے پتے پر خط لکھو۔ میں ہر روز

متوقع ہوں کہ عینی بی بی کا تار آتا ہوگا۔

C/O M A.H ISPHAHANI

تھا۔اب میرا خیال ہے اسلامی اخبارات ربعہ
صاحب پر پھر لے دے کریں گے۔" (۲۱)

یلدرم کے ان خطوط سے ہمیں ملک میں اس وقت چل رہی سیاست کی بھی پوری تاریخ ملتی ہے۔ جب بھی وہ سیاحت کی غرض سے بیرون ممالک جاتے تھے اس ملک کے متعلق اور سفر کے دوران گزرنے والے ہر ایک پل کا منظرنامہ اپنی بیوی سے بیان کرتے تھے۔جن میں جہاز پر سوار لوگوں کے حالات درج ہوتے یا پھر اگر جہاز کہیں کسی جزیرے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرا تو وہاں کے حالات کی تفصیل وہ اپنے خط میں ضرور لکھتے تھے ملاحظہ کیجئے:

"ہوٹل میٹرو پول۔نیپلز
یکم جون 24ء
کل POMPEJI دیکھا۔شہر کے کھنڈر موجود ہیں۔کمرے ان کے اندر خم شراب، کوزے، رکابیاں، چراغ۔بازار سڑکیں سب حد عبرت ناک نظارہ تھا۔VESUVIUS میں اب بھی دھواں نکل رہا ہے مگر اسی کے نیچے شہر نیپلز پھر انسانوں نے آباد کرلیا ہے۔اور اس میں بے خوف وخطر مصروف عیش وزر پرستی میں ہیں۔کل صبح دس بجے ROMA جائیں گے۔" (۲۲)

اس سفر کے دوران یلدرم نے جو کچھ بھی دیکھا اسے بہت سادے الفاظ میں

محسا ہے۔روم میں انھوں نے قدیم مصوری، روماے قدیم کے دیوتاؤں کے بت اور فرانس کے مشہور گرجے دیکھے۔یہاں کا قبرستان بھی دیکھا جو یورپ بھر میں عمدہ سمجھا جاتا ہے۔اسی سفر کے دوران وہ لندن بھی گئے تھے۔اور یہاں کی نمائش کی بھی انھوں نے بہت تعریف کی۔یہ سفر انھوں نے اس وقت کیا تھا جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے تھے۔قرۃ العین حیدر کا جس وقت رزلٹ آنے والا تھا وہ بڑے بے چین تھے کیونکہ ان دنوں وہ زیادہ تر دورے پر رہتے تھے لہذا جہاں جاتے وہاں کا پتہ دے دیتے کہ اس ایڈریس پر رزلٹ تار کردو۔ملاحظہ ہو

"کلکتہ

29 مئی 41ء

پیاری نذر السلام علیکم

تم فوراً ذیل کے پتے پر خط لکھو۔میں ہر روز

متوقع ہوں کہ تمنی بی بی کا تار آتا ہوگا۔

C/O M.A.H ISPHAHANI

5,CARMAC STREET

.CALCUTTA

یہاں کے اخبارات میں بنارس یونیورسٹی

کے نتیجے شائع نہیں ہوتے۔

سجاد" (۲۳)

رسالہ "نقاد" کے ایک شمارے میں کسی نے یلدرم کی وفات کی اطلاع غلطی

سے شائع کر دی تھی۔ اس پر انھوں نے ایڈیٹر "نقاد" جناب دلگیر صاحب کو ایک خط لکھا
تھا ملاحظہ کیجیے :

"--------- میرے پاس نومبر کا نقاد نہیں
پہنچا۔ نہ معلوم آپ نے اس میں کیا تحریر فرمایا ہے۔
صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ میں مرا تو ہوں، مگر
اس موت کی تشہیر کی کیا ضرورت تھی؟ خواہ مخواہ عزیزوں
اور احباب میں کھلبلی پڑ گئی۔ میرے پاس اور خطوط
بھی ایسے آ رہے ہیں۔ از راہ کرم "نقاد" کا وہ نمبر
جس میں میں مار ڈالا گیا ہوں، میرے دیکھنے کے
لیے بھیج دیجیے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ پس مردن
میری گل کے ساغر بنائے گئے ہیں یا خاک رہ گزر!
سجاد حیدر" (۴۴)

سجاد حیدر یلدرم ہر کسی کی خوشی میں خوش ہوتے اور ہر کسی کے غم میں برابر
کے شریک ہوتے۔ شمس العلماء تاجور نجیب آبادی کو شمس العلماء کے خطاب ملنے پر
مبارک بادی کے خط میں لکھتے ہیں

"جناب مولانا میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ
آپ کا نام فہرست خطابات میں دیکھ کر کتنی خوشی
ہوئی۔ آپ شمس الادباء تو پہلے ہی تھے۔ اب شمس
العلماء بھی ہو گئے۔ یعنی گورنمنٹ کے نزدیک، ورنہ

ہم تو شمس الادبا، شمس العلماء و شمس الشعراء آپ کو

مانتے چلے آئے ہیں۔

میری دلی مبارک باد قبول فرمائیں!

خاکسار

سجاد حیدر (یلدرمؔ)" (۲۵)

اس طرح سر محمد یعقوب کی وفات پر قاضی عبدالغفار کے نام ایک تعزیت نامہ لکھتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار، سر محمد یعقوب کے برادر نسبتی تھے۔ سر محمد یعقوب کے انتقال سے یلدرم بہت رنجیدہ ہوئے تھے اور ان کی یاد میں ایک نظم "ہمدم دیرینہ" لکھی تھی۔ یہ خط ملاحظہ ہو:

"تمہیں میں تعزیت نامہ کیا لکھوں۔ ہمدم

دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ

کر چلے جانے والے دوست کے نام ایک پیام بھی

------ سر یعقوب مرحوم کی قوم پرستی کی نہیں،

احباب پرستی کی یاد مجھے تڑپا رہی ہے۔

تمہارا

سجاد" (۲۶)

ریٹائرمنٹ کے بعد یلدرم کچھ عرصہ فارغ رہے۔ اس کے بعد راجہ صاحب آف محمود آباد کے پولیٹکل اسسٹنٹ مقرر ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ وہاں رہ کر بھی یلدرم اپنے بچوں اور بیوی کا پوری طرح خیال رکھتے تھے اور اپنی خیریت کا ایک خط روزانہ

دن بہت مبارک ہوگا جب ایسا ہو جائے۔ رہا آپ
احباب کی یہ کوشش کہ مجھے علی گڑھ دوبارہ بلائیں۔
مجھے اس کی کامیابی میں شبہ ہے۔ خدا وندان
یونیورسٹی۔

''ملاتے ہیں اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا
ہے۔'' (۲۹)

چار سال گزرنے کے بعد بھی یلدرم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے کوئی آفر نہ ملا اور یہ افواہیں گشت کرتی رہیں کہ یا تو انھیں بہ حیثیت رجسٹرار رکھیں یا پھر بہ حیثیت ریڈر شعبۂ اردو۔ مگر یلدرم کو اس کا افسوس نہ تھا وہ اپنی ڈپٹی کلکٹری میں بہت خوش تھے خواجہ غلام السیدین کو لکھتے ہیں:

''اس افسانے کے ملنے کے دوسرے یا تیسرے دن
آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کی رائے ہے کہ علی
گڑھ کے بست وکشاد مجھے رجسٹراری پر نہ لیں گے
بلکہ اردو کی ریڈری پر لیں گے۔ میں اس معاملے کو
آپ کے ہاتھ میں چھوڑتا ہوں۔ جو مناسب ہو
کیجیے۔

میں اٹاوہ تبدیل ہو کر آ گیا ہوں۔ رواروی میں
دہرہ دون سے جواب نہ دے سکا۔ معلوم نہیں آپ
آج کل کہاں ہیں۔ بہر حال یہ خط علی گڑھ ہی بھیجتا

ہوں۔

خاکسار

سجاد حیدر" (۳۰)

انسانی فطرت ہے کہ جب وہ اپنے کسی قریبی کو یا اپنے کسی عزیز کو خط لکھتا ہے تو کوئی غیریت مانع نہیں رہ جاتی اور انسان اپنے دل کی تمام باتیں، تمام حالات ہو بہو نقل کر دیتا ہے اور ہر چیز پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔ کوئی راز، راز نہیں رہ جاتا بس ایک بے تکلفی ان کے بیچ رچ بس جاتی ہے۔ مکاتیب اس لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہے کہ مکتوب نگار کی سوانح سے متعلق سب سے معتبر مواد اسی صنف سے ملتا ہے۔

افسوس کہ یلدرم کے بہت سارے خطوط ضائع ہو گئے ہیں جو چند ایک بچ گئے ہیں۔ ان میں ہمیں وہ فضا ملتی ہے جس میں ان کا عہد اور ان کا معاشرہ سانس لے رہا ہے۔ ان خطوط میں استعمال کی گئی زبان سادہ اور سلیس ہے اور مے درول، قافیہ پیمائی سے پاک ہے۔ اپنے خطوط میں یلدرم نے کہیں بھی استعاروں و تشبیہات سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی نثر میں کہیں پر بھی تصنع کا گمان نہیں گزرتا۔ بلا شبہ شہرۂ آفاق ادیب و شاعر سجاد حیدر یلدرم کا رتبہ و مرتبہ اردو ادب میں بہت بلند ہے۔

یلدرم کی شاعری

سجاد حیدر یلدرم نے جس طرح اردو نثر نگاری میں اہم مقام حاصل کیا اور ایک نئے طرز و اسلوب سے اردو نثر کو روشناس کرایا اسی طرح اردو نظم نگاری میں بھی وہ طرز بیان کے موجد ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے کبھی اپنے کلام کا مجموعہ شائع نہیں کیا۔ ورنہ لوگ تک بندی اور قافیہ پیمائی بھی کرتے ہیں تو صاحب دیوان کہلانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ یلدرم کی شاعری دلی تاثرات اور احساسات کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی شاعری آورد کے عیب سے پاک ہے۔ سید مبارز الدین رفعت نے ان کے کلام کو یکجا کیا اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں

"ان کے کلام کا یہ مختصر سا مجموعہ مختلف رسائل کے سینکڑوں اوراق گردانی کا نتیجہ ہے۔ بہت ممکن ہے ان کا اور بہت سا کلام ان کی بعض نثری تصانیف کی طرح ابھی غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہو۔ تاہم جو کچھ قابل حصول تھا اسی کو یلدرم کے شاعرانہ کمال کے اعتراف اور ایک ادبی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جارہا ہے" (۳۱)

ان کی شاعرانہ خوبی کی تعریف کرتے ہوئے مشتاق احمد زاہدی لکھتے ہیں

"سید صاحب اگرچہ اس معنی میں شاعر نہ تھے کہ وہ نہ صاحب دیوان تھے اور نہ پبلک مشاعروں میں

کرانے پر مدعو کئے جاتے تھے۔ لیکن اگر شاعر کے
معنی میں وہ شخص ہے جو شعر کہتا ہو تو سجاد صاحب
ضرور شاعر تھے۔ ان کا توسن طبع جس طرح نثر میں
شوخ و طرار تھا۔ اسی طرح نظم میں بھی ہوا سے باتیں
کرتا تھا۔" (۳۲)

شعر گوئی کا آغاز یلدرم نے طالب علمی کے زمانے سے ہی کیا تھا۔ ان کی طبیعت میں بلا کی شوخی پائی جاتی تھی۔ سن 1900ء جس وقت وہ علی گڑھ کالج میں پڑھ رہے تھے اس وقت حسرت موہانی بھی ان کے کلاس فیلو تھے۔ نواب محسن الملک نے جب حسرت موہانی کے والد سے کہا کہ وہ اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے انھوں نے اپنے ایک اکلوتے بیٹے حسرت موہانی کو علی گڑھ بھیجا۔ کالج کے لڑکوں نے ان کا حلیہ دیکھ ان کا نام "خالہ اماں" رکھ دیا تھا۔ لیکن یلدرم نے نظم "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" لکھ کر انھیں "مرزا پھویا" کا لقب دے دیا تھا۔

مرزا پھویا جس وقت کالج میں داخل کئے گئے تھے اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اور گھر سے باہر کی دنیا انھوں نے کبھی نہیں دیکھتی تھی۔ محسن الملک کی سحر بیانی کے زیر اثر حسرت موہانی کے والد جب ان کو علی گڑھ بھیجنے کا ارادہ کر لیا اس وقت گھر والوں کے تاثرات کو یلدرم اس طرح بیان کرتے ہیں

اس ارادہ کو جب کہا گھر میں	پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ ہائے ہائے	کوئی جا کر ذرا انھیں سمجھائے
میرا بچہ نہ جائے گا کوئل	میرا پتھر کا تو نہیں کچھ دل

مرزا کے والد کے آگے کسی کی ایک نہ چلی اور آخر مرزا کو علی گڑھ جانا پڑا۔ وداع کا یہ منظر ملاحظہ کیجئے:

خالہ اماں، ممانی، بھابی جان   اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان

آپا جانی نے بھی بلائیں لیں   سب نے مل مل کے یوں دعائیں دیں

یاالٰہی یہ خیرت سے پھرے   اور دشمن پہ انکی بجلی گرے

واسطہ مرتضٰی علی کا تجھے   جلد لا کر ملائیوں ہم سے

علی گڑھ پہنچ کر مرزا کو ایک الگ ہی دنیا نظر آتی ہے۔ جہاں کے لوگوں کے طور طریقے سب کچھ جدا لگتے ہیں۔ علی گڑھ کے حالات مرزا کی زبان شاعر اسطرح کہتا ہے:

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا   ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا

جنس ہر اک نئی دکان نئی   اور تو اور ہے زبان نئی

ایک دال ایک گوشت کہتے ہیں   جانئیں کس دیس میں یہ رہتے ہیں

ہوں پریشان تو "آلیا" فرمائیں   خوش ہوں گر تو "بیہ ہیز" یہ سنائیں

گر ہو اچھا لباس "ٹھاٹ" کہیں   اور گنواروں کو "راج گھاٹ" کہیں

بو تعم کی ہو ذرا سی بھی   اس کو کہتے ہیں یاں پہ میاں شی

درج ذیل اشعار میں ہمیں کالج کے اس وقت تک کے انتظامات سے روشناس کراتے ہیں کہ انتظامیہ کس حد تک اپنے اوقات کے تئیں سخت تھا۔ اس وقت طلباء کو بغیر اجازت شہر جانے کی ممانعت تھی جس کی شکایت مرزا اس طرح کرتے ہیں

یاں کی آزادی ہے بہت محدود   شہر جانا بھی ہو گیا مسدود

اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں
ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — پوریہ اک نیلی روشنائی کی
اک برش جوتہ صاف کرنے کا — اور برال کو بھی ساتھ تھوڑا سا
بوٹ کے لیس کی ضرورت ہے — اور موزے بھی چند اچھے سے
دو گھڑے اک صراحی پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار
اور باقی تو خیریت ہے سب — سب کو تسلیم زیادہ حد ادب

یلدرم نے یہ نظم مثنوی کی بحر میں لکھی ہے۔ اس نظم کا پہلا شعر ہم ردیف وہم قافیہ ہے اور مقطع ہم ردیف۔ اس نظم کی زبان پر ہمیں اس وقت علی گڑھ میں رائج زبان کے نقوش واضح انداز میں ملتے ہیں۔ سر سید رضا علی لکھتے ہیں

"یہ وہ زبان ہے جو اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے علی گڑھ کالج کی نسلی زبان تھی۔ علی گڑھ کے مخصوص محاورے زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم نہ دلی کے مرید ہیں نہ لکھنؤ کے چیلے۔ ہم تو اس وسیع اور تروتازہ چمن اردو کے نئے پودوں کے رنگیں پھول ہیں جو سرزمین کوئل پر اُگے تھے۔ یہ رنگ و بو آپ کہیں اور نہ پائیے گا ان پھولوں کو دیکھنے اور خوش بو سونگھنے کے لئے آپ کو کوئل ہی آنا پڑے گا۔" (۳۳)

داغ دہلوی کے انتقال پر یلدرم نے ایک مرثیہ لکھا تھا جو رسالہ "مخزن" لاہور میں شائع

پیدا ہوں گے نپولین وسکندر ہی ہوں گے جنھوں نے اپنی طاقت کے بل پر تمام دنیا فتح کی۔ جاپان کو وہ ایک بچے سے مماثل قرار دے کر کہتا ہے

ایک بچہ ہے ادھر خرس عظیم   ایک تارے کے مقابل میں ہے شیطان رجیم

آخر شعر میں شاعر جاپان کی کامیابی کو سراہتا ہے اور کہتا ہے

قالب مردہ مشرق میں پھر آتی ہے جاں   حاسد افسردہ ہیں دشمن کے خطا ہیں اوسان

یلدرم کی شاعری میں جو شوخی تھی اس کی مثالیں ان کی نظم "شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ" اور "لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرہ کی صدارتی نظم" میں نظر آتی ہے۔ نظم "شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ" یلدرم کی مشہور نظم ہے۔ جو پہلی بار جنوری 1926ء میں رسالہ "سہیل" میں شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو

ماتھے پہ بندی   آنکھوں میں جادو
ہونٹوں کی بجلی   گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی   بات بہکتی
جیسے کسی نے   پی ہو دارو
آنکھڑیاں ایسی   جن میں تھے رقصاں
لچھمن رادھا   لچھمن راہو
ایسی پھڑک تھی   خلق تھی حیران
ریل پہ آیا   کہاں سے آہو

مختصر سے الفاظ میں لکھی گئی اس نظم میں شاعر نے اپنے جذبات واحساسات کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہاں پر شاعر نے ریل کے بل کھانے اور

اخلاف نے کو ایک خوبصورت عورت کی چال اور اس کی پھڑک کو آہو سے تشبیہ دی ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ مختصر الفاظ میں ایک مکمل مصرعہ جس میں آزاد نظم کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح "لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرہ کی صدارتی نظم" میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں

کیوں مجھ کو کیا ہے صدر مجلس — کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جا ہے
جب دیکھئے تخت پر ہوں بیٹھا — منبر پہ ہو جیسے واعظ جی

اگلے اشعار میں وہ اپنا تعارف اس طرح دیتے ہیں

مانا کہ ہے میرا نامہ بخش — ہے دل میں تڑپ زبان میں تاثیر
رنگینی بھی ہے سخن میں ایسی — ہوتا ہے جوان عالم جی

شاعر اپنے دلی جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ میں شاعری کا دعوی نہیں کرتا نثر میں کچھ تحریر کیا ہے یہ بھی محض ایک شوق کے تحت کہہ رہا ہوں ورنہ میری تحریریں بھی ہیچ ہیں۔ میں صرف نثر کا شیدائی ہوں جس کے لیے میری یہاں آؤ پذیرائی ہو رہی ہے اس بزم میں میں ایک ادب پسند ہوں مجھے یہاں لا کر آپ نے میری تشہیر کی ہے جبکہ میں اپنے گوشہ نشین ہی اچھا تھا۔ شاعر اس نظم کے اختتام پر احباب کا شکریہ اس طرح ادا کرتا ہے

ممنون کرم ہوں لیکن اب تو — ہے تیری مرتبہ یہ تقدیر
رسم است کہ شاعقیں تحریر — آزاد کنند بندۂ پیر

یلدرم کے شوخی جذبات ان کی ایک اور نظم "دیکھ تو ہم نے تمہارا" میں بھی نظر آتا ہے۔ ٹرین میں موجود ایک ہم سفر اور ان کی فیملی کی مسرت کو دیکھ کر یلدرم

کے جذبات اشعار بن کر ان کے دل سے نکلتے ہیں۔ جن میں دلی محبت، عشق کی جنت، اصلی دولت اور حق کی رحمت اولاد ہی ہے۔ جو چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ دو تین پیارے بچے شکل میں پیارے۔ شریر ہیں تو کیا ہوا۔ آخری اشعار میں شاعر کہتا ہے تمہیں دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے کہ میں یہ جنت کس طرح پاؤں یہ جنت میرے پاس بھی ہے لیکن ساتھ نہیں۔

دوست احباب کی اور اپنے قریبی رشتہ داروں کی شادی پر بھی یلدرم نے نظمیں کہی ہیں۔ بھانجے عثمان حیدر کی شادی پر کہی گئی نظم کے اشعار

رخ پہ مسرت تھی عیاں لب پہ خوشی کی داستاں ۔۔۔ تیر و تبر تیغ و سناں رکھ کر ہوا سجدہ کناں

کرنے لگا ورد زباں شکر خدائے ذوالمنن ۔۔۔ جب شادیاں ہو ہر طرف جب رنج و غم ہوں برطرف

چھوٹے بھائی نصیر حیدر کی بیٹی عذرا کی شادی پر کہی گئی نظم

آج سعید ہے سعید، آج ہے اس کا روز عید ۔۔۔ غنچۂ آرزو امید نخل مراد بار دار

بنت نصیر نکتہ داں، صاحب علم بیکراں ۔۔۔ مایۂ ناز دختراں، علم و حیا کی تاجدار

اس نظم کے آخری شعر میں عروسی جوڑے کو دعائیں دیتے ہیں:

ان کا نصیب کامگار، ان کا زمانہ سازگار

غنچۂ گل کھلیں ہزار، ان کے چمن ہو بہار

"ایک بت پرست محمود" یہ نظم خواجہ غلام السیدین کی شادی پر یلدرم نے کہی تھی:

آج تو دل مقصود ہوا خواب ہوا ۔۔۔ اپنے ہم چشموں کا محسود ہوا خواب ہوا

ثروت و علم کا ہے آج قران السیدین ۔۔۔ علم ثروت پہ جو افزود ہوا خواب ہوا

نواب صاحب چھتاری جو یلدرم کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے ان

کو حکومت آصفیہ کی وزارت میں ایک اعلیٰ عہدہ ملنے پر انھوں نے ایک تہنیت نامہ لکھا تھا جس میں نواب صاحب کے لیے چند مخلصانہ نصیحتیں بھی تھیں۔ یہ نظم بہ عنوان "ایک اولڈ بوائے کی دعا ایک اولڈ بوائے کے لئے" شائع ہوئی تھی۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

اللہ نے کیا ہے تمھیں صاحب نفوذ　　　اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسبان
کوشش یہ ہو کہ خلق خدا کا رہے خیال　　　اور یہ نہ ہو، تمھاری جبین شہ کا آستان
سونپی گئی ہیں تم کو دکن کی مقدرات　　　اب اس کو خار زار بناؤ کہ گلستان

نظم "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" میں یلدرم نے اس وقت کی انتظامیہ کی بد مذاقی کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور اپنے جذبات کو نظم کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے اس نظم سے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہو

پڑھیئے چند غرض نہ پڑھانے سے واسطہ　　　استاد جامعہ کو ہوس خوشامد کی ہے
بھائی وظیفوں دوں کہ بھتیجے وظیفوں دوں　　　اب اپنے جد فکر انھیں خاندان کی ہے
ہو جامعہ میں روز نیا معرکہ تو کیا　　　ہم کو تو فصل گل و گلستان کی ہے

یلدرم کی نظم نگاری بہت اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ان موضوعات پر کیا ہے جو ابدی ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی ایک انفرادیت بھی ہے۔ یہ ایسے موضوع ہیں جس سے قاری کے جذبات وابستہ ہیں۔ ان کی نظموں میں قاری کہیں نہ کہیں خود کو بھی ڈھونڈتا ہے۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہو

رشتۂ　قہر　چھوڑو　مہر　کو لو　　　دونوں ہوں سینہ ریش قلب گداز؟

یہاں سے میں نہ ملک یک رنگی؟ — چھوڑ دیں کیوں نہ شہہ ناز و نیاز؟

آزادیٔ وطن کی خواہش ان کے دل میں بھی تھی لہٰذا نظم "شہیدانِ سیاست" میں کہتے ہیں

میرے دل میں ہے شوقِ جنگ و ستیز — نہیں مجھ کو پروائے صلح و سکون

میں خواہاں ہوں آزادیٔ ملک کا — نہ اس کے عوض دین و دنیا میں لوں

ترکی ادب سے دو نظمیں بعنوان "ترانۂ شوق" اور "بلبل" بھی یلدرم نے تراجم کی ہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں جب یلدرم پورٹ بلیئر میں رہ رہے تھے۔ اس وقت انھوں نے ایک نظم "قیدِ خود اختیاری" کے نام سے لکھی جس میں اپنے جذبات یوں بیان کرتے ہیں کہ دوستو تم کو مبارک ہو دنیا کی وسعتیں میری قسمت میں بس ایک تنگ جیل خانہ ہے۔ راحت کی تمنا اب ہم کو بالکل نہیں ہے۔ جو انسان جس چیز کے لیے کوشش کرتا ہے اس کی پوری ہونے کی امید ہوتی ہے لیکن اس قید سے رہائی کی امید بہت کم ہے۔

یلدرم کو حج البیت اللہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ جہاز رحمانی پر سوار ہو کر بمبئی سے جب نکلے تو ایک نظم "عزمِ حجاز" لکھی اور مومن کے مشہور مصرعے "مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ" پر نہایت دلکش انداز میں تضمین کی۔ حج پر جانے سے پہلے یلدرم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اہلِ خانہ منع کر رہے تھے۔ لیکن انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور حج پر جانے کا عزم کر لیا۔ اپنے اس عزم کا اظہار انھوں نے نظم "معقد لا انجیل" میں کیا ہے۔ جب کعبہ کے سامنے پہنچے تو جذبات کا دریا امڈ آیا اور مالکِ حقیقی سے شکوہ شکایت ہوئیں۔ دنیائے اسلام کی حالت اور یورپین طاقتوں کی

حرص کی وجہ سے مسلمان کس طرح ظلم کا شکار ہیں۔ ان سب حالات کو وہ اپنے دل میں چھپائے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں ان کو بیان کیا۔

عقدۂ لاینحل:

کوئی اب شامل ارباب وفا ہوتا ہے — آج وہ مائل انداز جفا ہوتا ہے
کوئی اب داخل زندان بلا ہوتا ہے — کوئی اب عیش و تنعم سے جدا ہوتا ہے

عزم حجاز:

سب غرور جاہ و راحت کاشانہ چھوڑ کر — سب حرص زر بہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
تو سن رہا ہے چاروں طرف یہی صدا — دیکھو تو گمراہی بت اب بت خانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

کعبے کے سامنے:

یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو — اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں
واقف ہے تو کہ درد بھرا ہمارا حال — کیا تیرے آگے درد بھرا ہی فسانے میں

انھوں نے اپنی شاعری کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا اور نہ اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی سعی کی۔ ان کے کلام میں دلی جذبات و احساسات کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ ان میں شاعرانہ صلاحیت موجود تھی جس کا ثبوت ان کی یہ چند نظمیں ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کو سجانے کے لیے الفاظ کی آرائش و زیبائش کی بجائے فکر کی داخلی آہنگ اور لہجے کی تعمیر پر بھرپور توجہ دی اور شعری وارداتوں کو اپنے فکری رویوں کے تحت موثر اور دلپذیر بنا دیا۔

حواشی

۱۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص50

۲۔سجاد حیدر یلدرم مرتب سید مبارز الدین رفعت ص35-34

۳۔ثالث بالخیر از سجاد حیدر یلدرم ص80

۴۔زہرا از سجاد حیدر یلدرم ص88-87

۵۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص20

۶۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص215

۷۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص293

۸۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص438

۹۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص466

۱۰۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص620

۱۱۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص22-21

۱۲۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص98

۱۳۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص110

۱۴۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص114

۱۵۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 115

۱۶۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص193

۱۷۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 198

۱۸۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص199

۱۹۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص201

۲۰۔ انتخاب سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قرۃ العین حیدر ص207

۲۱۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص110

۲۲۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص115

۲۳۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص134

۲۴۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص76

۲۵۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص74

۲۶۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص75

۲۷۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص 68

۲۸۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص63

۲۹۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص57

۳۰۔ دامان باغباں مرتبہ قرۃ العین حیدر ص65

۳۱۔ سجاد حیدر یلدرم مرتبہ سید مبارز الدین رفعت ص117

۳۲۔ مشتاق احمد زاہدی "سید سجاد حیدر یلدرم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتب سید مبارز الدین رفعت ص20

۳۳۔ سر سید رضا علی "یلدرم مرحوم" مشمولہ "سجاد حیدر یلدرم" مرتب سید مبارز الدین رفعت ص 76

☆☆☆

کتابیات

۱) اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء، ڈاکٹر سید عبداللہ، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور ۱۹۶۷ء

۲) اردو ادب ایک صدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۹۹ء

۳) اردو ادب کی تحریکیں (ابتدا تا ۱۹۵۷ء)، ڈاکٹر انور سدید، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۴ء

۴) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، پروفیسر احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ۲۰۱۴ء

۵) اردو ادب کی مختصر تاریخ، انور سدید، ایم۔ آر پبلیکیشنز، نئی دہلی ۲۰۱۳ء

۶) اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، منظر اعظمی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۹۶ء

۷) اردو ادب میں رومانی تحریک، محمد حسن، کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۹۶ء

۸) اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی (ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک)، ڈاکٹر خلیل احمد، نصرت پبلیشرز، لکھنؤ ۱۹۸۴ء

۹) اردو افسانہ، عزیز فاطمہ، نصرت پبلیشرز، لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۱۰) اردو افسانہ اور افسانہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۲ء

۱۱) اردو افسانہ روایت اور مسائل، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۱ء

۱۲) اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، پروفیسر صغیر افراہیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۱۳) اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، فردوس انور قاضی، اردو اکیڈمی سندھ، پاکستان

۱۹۸۹ء

۱۴) اردو افسانے کا ارتقاء، مسعود رضا خاکی، اردو اکیڈمی سندھ، پاکستان ۱۹۹ء

۱۵) اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ء کے بعد)، ڈاکٹر احمد صغیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء

۱۶) اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر سہنرا نور، نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۹۰ء

۱۷) اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳۔ ۲۰۰۹ء، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان ۱۹۹۱ء

۱۸) اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا، رام لعل، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۱۹) اردو افسانے کے ابتدائی نقوش، فیض رفعت، سنسار پبلشنگ ہاؤس، ممبئی ۱۹۹۹ء

۲۰) اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء

۲۱) اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید، عشرت رحمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۹ء

۲۲) اردو رومانی نثر کے معمار، ڈاکٹر محمد زاہد، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ ۲۰۰۲ء

۲۳) اردو فکشن، پروفیسر آل احمد سرور، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۲ء

۲۴) اردو فکشن کی تنقید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، تخلیق کار پبلشرز، دہلی ۱۹۹۶ء

۲۵) اردو کی ابتدائی نشوونما، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۷۹ء

۲۶) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۵۷ء

۲۷) اردو کے بہترین شخصی خاکے (جلد اول، دوم)، محسن مرزا، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۷ء

۲۸) اردو نثر کا فنی ارتقاء، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۲ء

۲۹) اردو نثر میں ادب لطیف، عبدالودود، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۹۰ء

۳۰) اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۶ء

۳۱) افسانوی ادب تحقیق و تجزیہ، عظیم الشان صدیقی، نیو پبلک پریس، نئی دہلی ۱۹۸۳ء

۳۲) افسانے کا منظر نامہ، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۹ء

۳۳) افسانے کی حمایت میں، شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ ۱۹۹۲ء

۳۴) انتخاب سجاد حیدر یلدرم، پروفیسر ثریا حسین، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۵ء

۳۵) انتخاب سجاد حیدر یلدرم، قرۃ العین حیدر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء

۳۶) انشائیے خندہ خال، وزیر آغا، نئی آواز، جامعہ نگر، دہلی ۱۹۹۱ء

۳۷) بیسویں صدی میں اردو افسانہ، گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۲۰۰۲ء

۳۸) تاریخ اردو ادب، رام بابو سکسینہ، ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی ۲۰۰۰ء

۳۹) تنقیدی اور تحقیقی مضامین، پروفیسر صادق، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۱۴ء

۴۰) تنقیدی دبستان، ڈاکٹر سلیم اختر، عاکف بک ڈپو، نئی دہلی ۲۰۰۳ء

۴۱) تنقیدی نظریات، پروفیسر احتشام حسین، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۹۱ء

۴۲) جدید اردو افسانہ، منظر شہزاد، عاکف بک ڈپو، نئی دہلی ۱۹۸۸ء

۴۳) جدید اردو افسانے میں سماجی و ثقافتی جہات، احمد طارق، ادارہ نیا سفر، الہ آباد ۲۰۰۶ء

۴۴) جدید اردو تنقید اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، کتاب پبلیشرز، لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۴۵) جدیدیت اور اردو افسانہ، اقلیمہ، ادبستان پبلیکیشنز، دہلی ۲۰۱۳ء

۴۶) حیات ابوالکلام آزاد، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۰ء

۴۷) خیالستان، سجاد حیدر یلدرم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۶ء

۴۸) داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۳ء

۴۹) داستان، ناول اور افسانہ، دردانہ قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۹ء

۵۰) دامانِ باغبان (مجموعۂ خطوط)، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء

۵۱) دہلی میں اردو افسانہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء، ڈاکٹر ظلِّ ہما، شاہد پبلی کیشنز، مرادآباد ۱۹۹۴ء

۵۲) سجاد حیدر یلدرم، سید مبارز الدین رفعت، ادارۂ دانش و حکمت، حیدرآباد ۱۹۴۶ء

۵۳) فنِ افسانہ نگاری، وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۳ء

۵۴) قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (اٹھارویں صدی تک)، محمد حسن، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۲۰۰۵ء

۵۵) قرۃ العین حیدر (ذات و صفات)، ڈاکٹر مجیب احمد خان، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۸ء

۵۶) کارِ جہاں دراز ہے، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۳ء

۵۷) کچھ ابوالکلام کے بارے میں، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۵۸) کفِ گل فروش، قرۃ العین حیدر، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۳ء

۵۹) کہانی کے پانچ رنگ، شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی ۱۹۸۳ء

۶۰) گنجہائے گرانمایہ، رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۸۳ء

۶۱) مطالعہ یلدرم، سید معین الرحمٰن، نذر سنز، لاہور ۱۹۷۱ء

۶۲) نیا افسانہ مسائل و میلانات، پروفیسر قمر رئیس، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۱۰ء

۶۳) ہما خانم، سجاد حیدر یلدرم، انڈیا بک ہاؤس، حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ء

۶۴) ہماری داستانیں، وقار عظیم، مکتبہ عالیہ، رام پور ۱۹۶۸ء

رسائل و جرائد

رسالہ کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
ماہنامہ اوراق	لاہور، پاکستان	ستمبر،اکتوبر ۱۹۸۱ء
سہ ماہی انجمن ترقی اردو ہند	نئی دہلی	اپریل ۱۹۲۷ء
سہ ماہی انجمن ترقی اردو ہند	نئی دہلی	جولائی ۱۹۲۷ء
سہ ماہی انجمن ترقی اردو ہند	نئی دہلی	جنوری ۱۹۳۶ء
ششماہی راوی	جمشید پور، جھارکھنڈ	جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴ء
ماہنامہ ادب نما	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	ستمبر ۲۰۰۷ء
ماہنامہ ادب نما	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی	ستمبر ۲۰۰۸ء
ماہنامہ نقوش	لاہور، پاکستان	۱۹۵۵ء
سہ ماہی تکمیل	بھیونڈی، ممبئی	جنوری تا جون ۲۰۰۶ء
ماہنامہ پگڈنڈی (یلدرم نمبر)	امرتسر	۱۹۸۰ء
ماہنامہ اردو دنیا	نئی دہلی	اکتوبر ۲۰۰۸ء
ماہنامہ آج کل	دہلی	دسمبر ۱۹۳۶ء
ماہنامہ اوراق	لاہور، پاکستان	اپریل ۱۹۸۲ء
ماہنامہ شب خون	الہ آباد	ستمبر ۱۹۷۰ء
علی گڑھ میگزین	علی گڑھ	دسمبر ۱۹۳۲ء
ماہنامہ ماہ نو	لاہور، پاکستان	جون ۱۹۸۸ء
ماہنامہ نقوش	کراچی، پاکستان	دسمبر ۱۹۵۹ء

سوانحی کوائف

نام :اسود گوہر

قلمی نام :اسود گوہر

والد :محمد عبدالحفیظ

والدہ :سیدہ عاقلہ بیگم

جائے پیدائش :اورنگ آباد (دکن)

تعلیم :بی۔ایس۔سی (کمپیوٹر)، ایم۔اے (اردو)،
ایم۔فل (اردو)، پی۔ایچ۔ڈی (جاری)

ادبی مشاغل :انشائیہ نگاری، مضمون نویسی

کتابیں (طبع زاد): جسارت ۲۰۱۶ (تنقیدی مضامین کا انتخاب)
تنقیدی محاکات ۲۰۱۰ (تنقیدی مضامین کا انتخاب)

زیر طبع نجل منصوص (تنقیدی مضامین کا انتخاب)

اعزاز و انعام :مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو ساہتیہ اکادمی کا 'ساحر لدھیانوی نیوٹیلینٹ'
ریاستی ایوارڈ ۲۰۱۶ء

موجودہ پتہ :پلاٹ نمبر ۲۶، نزد ہاشمی مسجد، بسم اللہ کالونی، اورنگ آباد،
مہاراشٹرا 431001

aswadgowher@gmail.com

SAJJAD HAIDER YALDERIM KA FIKR-O-FAN

By

Aswad Gowher

''سجاد حیدر یلدرم کا فکر وفن'' کتاب کا مسودہ میرے سامنے ہے اسود گوہر نے سجاد حیدر یلدرم کے اوپر اپنا ایم۔فل کا مقالہ مکمل کیا ہے۔ سجاد حیدر انگریزی دور کے نہ صرف ذی علم، ذی عقل شخص تھے بلکہ دور اندیش شخص بھی تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے انگریزی تعلیم، ماحول اور مغربی علوم کو نہ صرف قبول کیا، اس پر عمل پیرا بھی ہوئے۔ ساتھ ہی اپنے خاندان کو مشرقی ومغربی علوم سے روشناس بھی کرایا۔

خوشی اس بات کی ہے کہ عرصۂ دراز کے بعد سجاد حیدر یلدرم پر کسی نے قلم اٹھایا ہے۔ اسود گوہر نے اپنی اس کتاب میں سجاد حیدر کے فکر وفن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

میں صمیم قلب سے عزیزی اسود گوہر کو ان کی اس محنت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعاء گو ہوں کہ ان کی یہ کتاب اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کرے گی۔ ساتھ ہی ادب کی دنیا میں اس کتاب کو قدر کی نہ صرف نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ بلکہ عوام الناس سے داد تحسین بھی حاصل کرے گی۔

محمد سبحان، دہلی

ISBN 978-93-87829-41-1

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi, INDIA